ٹھنڈا گوشت
سعادت حسن منٹو
1/-

چند لفظوں میں

منٹو کی سچائی اور بے باکی سے بہت سے لوگ ڈرتے تھے۔ اُس کی زندگی میں اُس پر بہت سے مقدمے چلائے گئے کیونکہ وہ ہمارے سماج کی گندگی کو بے نقاب کرتا تھا اور جنسی کمزوری کی بڑھتی ہوئی بیماری پر اپنے قلم کا تیز ابی نشتر رکھ دیتا تھا۔ منٹو کی سفاکی اور بے رحمی ضرب المثل ہے لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ منٹو کے بے رحم طنز میں انسان کی محبت مجبت کی مایوسی اور مایوسی کے سارے آنسو چھپے ہوئے ہیں۔ جب تک لوگ پڑھتے رہیں گے۔ منٹو زندہ رہے گا۔

فہرست

مقدمہ - جو "ٹھنڈا گوشت" پر چلایا گیا 5

ٹھنڈا گوشت 63

بابو گوپی ناتھ 73

شادی 95

بلونت سنگھ مجیٹھیا 113

ناشران

مشورہ بک ڈپو

رام نگر، گاندھی نگر، پوسٹ بکس 1639 دہلی

نومبر ۱۹۶۰ء

مشورہ پاکٹ بکس میں شائع ہونے والے تمام کردار مقامات
واقعات فرضی ہیں۔ اور ان کا کسی شخص جگہ واقعہ یا ادارہ
سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کسی فرد مقام یا ادارے سے مطابقت
قطعی اتفاقیہ ہے اور اس کے لئے مصنف یا پبلشر کسی طرح
کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتے۔

عام فہم اردو زبان میں مشہور و معروف ادیبوں کے لاجواب اور معرکۃ الآرا
شاہکار نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کرنے والا ادارہ!

ناشران
مشورہ بک ڈپو
رام نگر گاندھی نگر پوسٹ بکس 1639 دہلی ۶

قیمت فی کتاب صرف ایک روپیہ

(اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی)

مقدمہ!

جو ٹھنڈا گوشت پر چلایا گیا

بمبئی چھوڑ کر کراچی سے ہوتا ہوا سات یا آٹھ جنوری ۱۹۴۸ء کو یہاں لاہور پہنچا۔ تین مہینے میرے دماغ کی عجیب و غریب حالت رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ بمبئی میں ہوں۔ کراچی میں اپنے دوست حسن عباس کے گھر بیٹھا ہوں یا لاہور میں ہوں جہاں کئی ریستورانوں میں قائد اعظم فنڈ جمع کرنے کے سلسلے میں رقص و سرود کی محفلیں اکثر جمتی تھیں

تین مہینے تک میرا دماغ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پردے پر ایک ساتھ کئی فلم چل رہے ہیں۔ آپس میں گڈ مڈ۔ کبھی بمبئی کے بازار اور اس کی گلیاں۔ کبھی کراچی کی چھوٹی چھوٹی تیز رفتار ٹریمیں اور گدھا گاڑیاں اور کبھی لاہور کے پرشور ریستوران۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا میں کہاں ہوں — سارا دن کرسی پر بیٹھا خیالات میں کھویا رہتا۔ آخر ایک دن چونکا کیونکہ جو روپیہ میں بمبئی سے اپنے ساتھ لایا تھا کچھ تو گھر میں اور کچھ گھر سے کچھ دور کلفٹن بار میں جذب ہو چکا تھا۔ اب مجھے قطعی طور پر پتہ چل گیا کہ میں لاہور میں ہوں۔ جہاں کبھی کبھی میں اپنے مقدمات کے سلسلے میں آیا کرتا تھا اور کرنال شاپ سے بہت سے خوبصورت چپل خرید کر اپنے ساتھ

لے جایا کرتا تھا ۔

میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کیا کام کیا جائے۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ تقسیم کے بعد فلمی کاروبار قریب قریب مفلوج ہو چکا ہے۔ جن فلم کمپنیوں کے بورڈ نظر آتے ہیں۔ وہ ان بورڈوں ہی تک محدود ہیں ۔ بہت تشویش ہوئی سالا ٹمنٹوں کا بازار گرم تھا۔ مہاجر اور غیر مہاجر دھڑا دھڑ اپنے اثر و رسوخ سے کارخانے اور دوکانیں الاٹ کرا رہے تھے ۔ مجھے مشورہ دیا گیا۔ مگر میں نے اس لوٹ کھسوٹ میں حصہ نہ لیا ۔

انہی دنوں معلوم ہوا کہ فیض احمد فیض اور چراغ حسن حسرت مل کر ایک روزنامہ جدید خطوط پر شائع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میں ان حضرات سے ملا۔ اخبار کا نام "امروز" تھا جو آج ہر ایک کی زبان پر ہے۔ پہلی ملاقات پر اخبار کی "ڈمی" تیار کی جا رہی تھی۔ دوسری ملاقات ہوئی تو "امروز" کے غالباً چار پرچے نکل چکے تھے ۔ اخبار کی گٹ اپ دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ طبیعت میں اکساہٹ پیدا ہوئی کہ لکھوں لیکن جب لکھنے بیٹھا تو دماغ کو منتشر پایا۔ کوشش کے باوجود ہندوستان کو پاکستان سے اور پاکستان کو ہندوستان سے علیحدہ نہ کر سکا۔ بار بار دماغ میں یہ الجھن پیدا کرنے والا سوال گونجتا۔ کیا پاکستان کا ادب علیحدہ ہوگا۔ اگر ہوگا تو کیسے ہوگا۔ وہ سب کچھ جو سالم ہندوستان میں لکھا گیا تھا اس کا مالک کون ہے ۔ کیا اس کو بھی تقسیم کیا جائے گا ۔ . . . .

. . . کیا ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے بنیادی مسائل ایک جیسے نہیں ۔ کیا ادھر اردو بالکل ناپید ہو جائے گی ۔ یہاں پاکستان میں اردو کیا شکل اختیار کرے گی ۔ کیا ہماری اسٹیٹ مذہبی اسٹیٹ ہے۔ اسٹیٹ کے تو ہم ہر حالت میں وفادار رہیں گے۔ مگر کیا ہمیں حکومت پر نکتہ چینی کی اجازت ہوگی ۔ آزاد ہو کر کیا

یہاں کے حالات فرنگی عہد حکومت کے حالات سے مختلف ہوں گے۔

گرد و پیش جدھر بھی نظر ڈالتا تھا انتشار ہی انتشار دکھائی دیتا تھا۔ کچھ لوگ بے حد خوش تھے کیونکہ ان کے پاس ایک دم دولت آگئی تھی لیکن اس خوشی میں بھی انتشار تھا۔ جیسے وہ بکھر کر ایک دن ہوا ہو جانے والی ہے ۔۔۔ اکثر مغموم و متفکر تھے کیونکہ وہ لٹ پٹ کر آئے تھے ۔۔۔ مہاجروں کے کیمپ دیکھے۔ یہاں خود انتشار کے رونگٹے کھڑے دیکھے۔ کسی نے کہا اب تو حالات بہت بہتر ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کی حالت دیدنی تھی۔ میں سوچنے لگا اگر یہ حالات کی بہتری ہے تو ابتری معلوم نہیں کیسی ہوگی ۔۔ غرض کہ عجیب افراط و تفریط کا عالم تھا۔ ایک کا قہقہہ دوسرے کی آہ سے دست و گریباں تھا۔ ایک کی زندگی دوسرے کے عالم نزع سے مصروف پیکار تھی۔ دو دھارے بہہ رہے تھے۔ ایک زندگی کا دھارا ایک موت کا۔ ان کے درمیان خشکی تھی جس پر گرسنگی و تشنگی شکم سیری و بلانوشی ساتھ ساتھ چلتی تھیں؛ فضا پر مردنی طاری تھی جس طرح گرمیوں کے آغاز میں آسمان پر بے مقصد اڑتی ہوئی چیلوں کی چیخیں اداس ہوتی ہیں اسی طرح "پاکستان زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد" کے نعرے بھی کانوں کو اداس اداس لگتے تھے۔

ریڈیو کی لہریں اقبال مرحوم کا یک آہنگ کلام شب و روز اپنے کاندھوں پر اٹھا اٹھا کر تھک اور اکتا گئی تھیں۔ فیچر پروگرام کچھ اس قسم کے ہوتے تھے کہ مرغیاں کس طرح پالی جاتی ہیں۔ جوتے کیسے بنائے جاتے ہیں۔ فن دباغت کیا ہے رفیوجی کیمپوں میں کتنے آدمی آئے اور کتنے گئے۔

قریب قریب تمام درخت ننگے بچے تھے ۔۔ سردیوں سے بچنے کے لئے غریب مہاجرین نے ان کی چھال اتار کر اپنی کھال گرم کی تھی۔ ٹہنیاں کاٹ کر

پیٹ کی آگ ٹھنڈی کی تھی۔ ان ننگے بُچے درختوں سے فضا اور بھی دل شکن حد تک اُداس ہو گئی تھی۔

بلڈنگوں کی طرف دیکھتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا سوگ میں ہیں۔ ان کے مکیں بھی ماتم زدہ تھے۔ بظاہر ہنستے تھے۔ کھیلتے تھے۔ کوئی کام مل جاتا تھا تو وہ بھی کرتے تھے مگر گویا یہ سب کچھ خلا میں ہو رہا تھا۔ ایک ایسے خلا میں جو لبالب ہونے پر بھی خالی تھا۔

میں اپنے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی سے ملا۔ ساحر لدھیانوی سے ملا۔ ان کے علاوہ اور لوگوں سے بھی ملا۔ سب میری طرح ذہنی طور پر مفلوج تھے۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ جو آتا زبردست بھونچال آیا ہے۔ شاید اس کے کچھ جھٹکے آتش فشاں پہاڑ میں اٹکے ہوئے ہیں۔ باہر نکل آئیں تو فضا کی نوک پلک درست ہو گی۔ پھر صحیح طور پر معلوم ہو سکے گا کہ صورتِ حالات کیا ہے۔

سوچ سوچ کر میں عاجز آ گیا تھا۔ چنانچہ آوارہ گردی شروع کر دی بے مطلب سارا دن گھومتا رہتا تھا۔ خود خاموش رہتا لیکن دوسروں کی سنتا رہتا ۔ ۔ بے ہنگم باتیں، بے جوڑ دلیلیں، خام سیاسی مباحثے ـــــ اس آوارہ گردی سے یہ فائدہ ہوا کہ میرے دماغ میں جو گرد و غبار اڑ رہا تھا آہستہ آہستہ بیٹھ گیا اور میں نے سوچا کہ ہلکے پھلکے مضامین لکھنا چاہئیں، چنانچہ میں نے "ناک کی قسمیں" "دیواروں پر لکھنا" جیسے فکاہیہ مضامین "امروز" کے لئے لکھے جو پسند کئے گئے ـــــ آہستہ آہستہ مزاج خود بخود طنزیہ رنگ اختیار کر گیا۔ یہ تبدیلی مجھے بالکل محسوس نہ ہوئی۔ میں لکھتا گیا اور میرے قلم سے "سوال پیدا ہوتا ہے" اور "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" جیسے تیز و تند مضمون نکل گئے ـــ جب مجھے اس امر کا احساس ہوا کہ میرے قلم نے گرد و پیش چھائی ہوئی دھند میں ٹٹول ٹٹول کر ایک راستہ تلاش کر لیا ہے تو مجھے

خوشی ہوئی۔ دماغ کا بوجھ بھی کسی قدر ہلکا ہوگیا۔ میں نے زور شور سے لکھنا شروع کر دیا۔ مضامین کا یہ مجموعہ بعد میں "تلخ ترش اور شیریں" کے عنوان سے شائع ہوا۔

طبیعت افسانے کی طرف مائل نہیں ہوتی تھی۔ اس صنفِ ادب کو میں بہت سنگین سمجھتا ہوں۔ اس لیئے افسانہ لکھنے سے گریز کرتا تھا۔ لیکن انہی دنوں میرے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی جو غالباً اوٹ پٹانگ چیزیں لکھ لکھ کر تنگ آگئے تھے۔ ریڈیو پاکستان پشاور سے علیحدہ ہوکر لاہور چلے آئے اور "ادارہ فروغِ اُردو" کے اشتراک سے ایک ماہنامہ پرچہ "نقوش" جاری کیا۔ ان کے اصرار کے باوجود میں "نقوش" کے پہلے چند پرچوں کے لیئے کوئی کہانی نہ لکھ سکا۔ جب وہ ناراض ہوگئے تو میں نے پاکستان میں اپنا پہلا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" لکھا جو میرے اس مجموعے کا اب عنوان ہوگیا ہے۔

قاسمی صاحب نے یہ افسانہ میرے سامنے پڑھا۔ وہ خاموش پڑھتے رہے۔ مگر مجھے اُن کا ردِ عمل معلوم نہ ہوسکا۔ افسانہ ختم کرلے کے بعد انھوں نے مجھ سے معذرت بھرے لہجے میں کہا: "منٹو صاحب معاف کیجیئے افسانہ بہت اچھا ہے لیکن "نقوش" کے لیئے بہت گرم ہے۔"

قاسمی صاحب سے کبھی بحث نہیں ہوئی تھی اس لیئے میں نے خاموشی سے افسانہ واپس لے لیا اور ان سے کہا: "بہت بہتر تو میں آپ کے لیئے دوسرا افسانہ لکھ دونگا۔ آپ کل شام تشریف لے آیئے گا۔"

قاسمی صاحب جب دوسرے روز شام کو تشریف لائے تو میں اپنے دوسرے افسانے "کھول دو" کی اختتامی سطور لکھ رہا تھا۔ میں نے قاسمی صاحب سے کہا: "ایک منٹ آپ بیٹھیئے میں افسانہ مکمل کرکے آپ کو دیتا ہوں"۔ اس افسانے کی اختتامی سطور چونکہ بہت ہی اہم تھیں اس لیئے قاسمی صاحب کو کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔

جب افسانہ مکمل ہو گیا تو میں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا "پڑھ لیجئے۔ خدا کرے آپ کو پسند آجائے"

قاسمی صاحب نے افسانہ پڑھنا شروع کیا۔ اختتامی سطور پر پہنچے تو میں نے نوٹ کیا جیسے کسی نے ان کو جھنجھوڑ دیا ہے۔۔۔ افسانہ ختم کرنے کے بعد وہ کچھ نہ بولے میں نے ان سے پوچھا "کیسا ہے؟"

قاسمی صاحب پر افسانے کا اثر ابھی تک غالب تھا مختصراً کہا "اچھا ہے۔۔۔ میں لیئے جاتا ہوں"۔۔۔ اور آپ رخصت لے کر چلے گئے۔

"کھول دو" قاسمی صاحب کے پرچے "نقوش" میں شائع ہوا۔ قارئین نے پسند کیا ہر ایک کا ردعمل یکساں تھا۔ آخری سطور سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی تھیں لیکن ایک دم ہم سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والا حادثہ وقوع پذیر ہوا حکومت کو یہ افسانہ امن عامہ کے مفاد کے منافی نظر آیا۔ چنانچہ حکم ہوا کہ "نقوش" کی اشاعت چھ مہینے تک بند رہے۔ اخباروں میں حکومت کے اس اقدام کے خلاف احتجاجاً بہت کچھ لکھا گیا مگر امتناعی حکم اپنی جگہ پر قائم رہا۔

میں نے ایک روز قاسمی صاحب سے مسکرا کر کہا "اگر آپ 'ٹھنڈا گوشت' شائع کرتے تو شاید یہ بجلی آپ کے آشیانے پر نہ گرتی"

کافی دن گزرنے پر ادب لطیف کے نائب مدیر میرے پاس آئے اور ٹھنڈا گوشت لے گئے۔۔۔ افسانے کی کتابت ہو گئی۔ کاپیاں جم گئیں۔ پروف نکل آئے۔ غلطیاں درست کر کے جب واپس پریس میں گئیں تو کسی کی نظر "ٹھنڈا گوشت" والی کاپی پر پڑی۔ اس نے افسانہ پڑھا تو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ قہر درویش برجان درویش اس افسانے کے بغیر ہی پرچہ شائع کیا گیا۔

چودھری برکت علی صاحب کوئٹے میں تھے واپس آئے تو انھوں نے "ادب لطیف"

کے دوسرے شمارے میں "ٹھنڈا گوشت" چھپوانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ افسانے کا مسودہ مجھے واپس دے دیا گیا۔

اس دوران میں کراچی سے محترمہ ممتاز شیریں کے متعدد خط آچکے تھے کہ میں ان کے "نیا دور" کے لئے کوئی افسانہ بھیجوں میں نے اُٹھا کر "ٹھنڈا گوشت" ان کو روانہ کر دیا۔ کافی دیر کے بعد جواب آیا کہ ہم دیر تک سوچتے رہے کہ اسے شائع کیا جائے یا نہیں۔ افسانہ بہت اچھا ہے۔ مجھے بہت پسند ہے لیکن ڈر ہے کہ حکومت کے احتساب کے شکار نہ ہو جائیں "ٹھنڈا گوشت"۔ یہاں سے بھی ٹھنڈا ہو کر واپس میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے سوچا اب اسے کسی رسالے میں نہیں چھپوانا چاہیئے۔

چھ مہینے کی عدت پوری نہیں ہوئی تھی کہ حکومت نے "نقوش" پر سے "نہ چھاپو" والی قید ہٹا دی۔ چنانچہ میں نے "نیا ادارہ" کے لئے ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا عنوان میں نے "نمرود کی خدائی" رکھا۔ اس میں "کھول دو" کے ساتھ میں نے "ٹھنڈا گوشت" بھی شامل کر دیا۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ عزیزی عارف عبدالمتین رسالہ "جاوید" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو آپ میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں ان کو "ٹھنڈا گوشت" کا مسودہ اشاعت کے لئے دوں۔ کافی دیر کی ٹال مٹول کے بعد آخر کار ان کے پیہم اصرار پر میں نے "نیا ادارہ" کے مالک چودھری نذیر احمد صاحب کو ایک چٹ لکھ دی کہ یہ "جاوید" والے اپنا پرچہ ضبط کرانا چاہتے ہیں — براہ کرم ان کو "ٹھنڈا گوشت" کا مسودہ دے دیجئے۔ عارف صاحب افسانے کا مسودہ لے آئے۔ اور اسے "جاوید" کے خاص نمبر مطبوعہ مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع کر دیا۔

پرچہ چھپ کر مارکیٹ میں آگیا۔ اندرونی اور بیرونی ایجنسیوں میں بھی تقسیم ہو گیا یہاں تک تو خیریت رہی۔ ایک مہینہ گذر گیا۔ میں مطمئن ہو گیا کہ اب "ٹھنڈا گوشت"

پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ مگر پریس برانچ کی باگیں ابھی تک چودھری محمد حسین صاحب (اب مرحوم) کے ہاتھ میں تھیں۔ گو ضعیفی کے باعث ان کے ہاتھ بہت کمزور ہو چکے تھے مگر انھوں نے زور کا ایک جھٹکا دیا اور پولیس کی مشینری حرکت میں آگئی۔

میں نے ایک روز اڑتی اڑتی سُنی کہ چھاپہ پڑا ہے اور پولیس "جاوید" کے خاص نمبر کے پرچے اٹھا کر لے گئی ہے میں نے جان پہچان کے چند لوگوں سے پوچھا کسی نے اس خبر کی تصدیق کی کسی نے کہا "اجی ہٹائیے۔ یہ جاوید والوں کا پبلسٹی اسٹنٹ ہے۔" اس دوران میں "جاوید" کے مالک مسٹر نصیر انور کا رقعہ ملا۔

منٹو صاحب!

ایک خبر سُنئے ـــــ آج پولیس نے دفتر "جاوید" پر چھاپہ مارا تلاشی لینے پر بچے کھچے چند پرچے اپنے قبضے میں لے لیئے۔ باقی پرچوں کی جانچ پڑتال ہوئی تو ڈسپیچ رجسٹر نے واضح کر دیا کہ تمام پرچے ہندوپاک کے مختلف اسٹیشنوں پر سپلائی ہو چکا ہے۔

رجسٹر میں سے تمام ایجنسیوں کے پتے نوٹ کر لیئے گئے اور آئندہ سپلائی کا حساب کتاب بند کر دیا گیا۔ یہ کارروائی گرفتاری کا پیش خیمہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ جلدی ملزموں کے کٹہرے میں ہوں گے۔ لیکن ایک اور بات قابلِ ذکر ہے کہ ایک مقامی ادارہ اس چھاپے کو اختراع اور پروپیگنڈے سے منسوب کرتا ہے مجھے حیرت ہے کہ ایسا کیوں ہے۔

خیر اس کی تصدیق خود بخود ہو جائے گی مجھے تو یہ کہنا ہے کہ اب ذرا وہیں چلیئے جہاں تین بار سزا پانے پر آپ بری قرار دیئے گئے میرا خیال ہے کہ یہ بار آخری بار ہو گی۔"

خبر کی تصدیق ہوگئی۔ معاملہ پریس ایڈوائزری بورڈ کے سامنے پیش ہوا جس کے کنوینر کرنل فیض احمد فیض اڈیٹر پاکستان ٹائمز تھے۔ اس میں "جاوید" کے مالک مسٹر نصیر انور بھی موجود تھے۔ ان کی زبانی اس میٹنگ کی مختصر روئداد سنیئے۔

پاکستان ٹائمز کے دفتر میں پریس ایڈوائزری بورڈ کی میٹنگ تھی فیض احمد فیض کنوینر تھے۔ میٹنگ میں ایف ڈبلیو بسٹن (سول ملٹری گزٹ) مولانا اختر علی (زمیندار) حمید نظامی (نوائے وقت) وقار انبالوی (سفینہ) اور امین الدین صحرائی (جدید نظام) شریک تھے۔ چودھری محمد حسین نے "جاوید" کا خاص نمبر پیش کیا۔ آپ نے سب سے پہلے پرچے کے باغیانہ اور اشتعال انگیز مضامین نظم و نثر گنوائے "غلامی سے آزادی تک"، "رقص بسمل"، "سیلاب چین"۔ یہ تھیں نظمیں۔ مضامین میں سے "لورینگ سے فلیٹی تک"، "کھیڑا بہادر کی جے" اور "چین کتنی دور ہے" زیر بحث لائے گئے۔ فیض حکومت کے عائد کردہ الزام کی تردید کرتے رہے۔ دیگر اراکین نے ہاں میں ملائی اور یوں یہ الزام ٹل گیا۔ لیکن نزلہ گرا "ٹھنڈا گوشت" پر۔ فیض نے جب اسے غیر فحش قرار دیا تو مولانا اختر علی گرج اٹھے "نہیں نہیں، اب ایسا ادب پاکستان میں نہیں چلے گا۔" جناب صحرائی نے اس پر صاد کیا۔ وقار صاحب نے افسانے کو ملعون و مطعون قرار دیا۔ حمید نظامی نے نوائے وقت کا ساتھ دیا۔ اور جب ایف۔ ڈبلیو بسٹن کو چودھری صاحب نے انگریزی میں "ٹھنڈا گوشت" سمجھایا تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ فرمانے لگے "اس کہانی کی تھیم یہ ہے کہ ہم مسلمان اتنے بے غیرت ہیں کہ سکھوں نے ہماری مردہ لڑکی تک نہیں چھوڑی......" مجھے ہنسی تو آ گئی تھی۔ لیکن جب چودھری

صاحب غلط ترجمانی پر مصر رہے تو مجھے افسوس ہوا۔ میں نے لاکھ سمجھایا
فیض صاحب نے بھی ہر طرح سے اطمینان دلایا۔ لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ اب
عدالت ہی اس کا فیصلہ کرے۔"

چنانچہ چند دن بعد میں، نصیر انور اور عارف عبدالمتین گرفتار کر لیے گئے۔
گرفتار کرنے والے سب انسپکٹر چودھری خدا بخش تھے۔ بے حد شریف۔ کئی دن
میرے مکان کے چکر کاٹتے رہے۔ ان دنوں میں اکثر باہر ہوتا۔ آخر ایک روز وہ
مجھ سے ملنے میں کامیاب ہو گئے۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور کہا "کل صبح کسی
دوست کے ساتھ تھانہ سول لائنز میں تشریف لے آئیے گا۔ تاکہ آپ کی ضمانت
ہو جائے"۔ اس سے پہلے کئی مرتبہ مجھے پولیس کے آدمیوں سے پالا پڑ چکا تھا۔
چودھری خدا بخش صاحب کا نرم رویہ مجھ پر بہت اثر انداز ہوا۔

دوسرے روز صبح کو میں تھانے میں حاضر ہو گیا۔ میرے دوست شیخ سلیم نے
دستخط کیے اور ہم مقدمے کے پہلے مرحلے سے فارغ ہو گئے۔

عارف عبدالمتین بہت ہی پریشان تھے۔ ان کا حلق خشک ہو جاتا تھا۔
یہ حیرت کی بات ہے۔ کیونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں عدالت سے
خدا معلوم کیوں اتنے خائف تھے۔ بہر حال سمن جاری ہوئے۔ سماعت کی تاریخ مقرر
ہوئی اور ہم تینوں ضلع میں حاضر ہوئے۔

میرے لیے یہ جگہ کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ اپنے پچھلے تین مقدموں کے سلسلے میں یہاں
کئی مرتبہ آ چکا تھا اور دھول پھانک چکا تھا۔ نام تو ضلع کچہری ہے لیکن بے حد
غلیظ جگہ ہے۔ مچھر، مکھیاں، کیڑے مکوڑے۔۔۔ جنگلوں اور ریڑیوں کی جھنکار
نہایت ہی دقیانوسی ٹائپ رائٹروں کی اکتا دینے والی ٹپ ٹپ تین ٹانگوں
والی کرسیاں جن کی نشست کا بیدہی غائب ہے۔ دیواروں پر سے پلستر اکھڑ رہا ہے

بارغ ہے جس کا لان افلاس زدہ میلے کچیلے کشمیری کے سر کی طرح گنجا ہے ۔ برقع پوش عورتیں ننگے گردے اَٹے ہوئے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہیں ۔کوئی گندی گالیاں بک رہا ہے ۔کوئی بسور رہا ہے ۔ اندر کمروں میں مجسٹریٹ صاحبان نہایت ہی واہیات میزوں کے پاس بیٹھے مقدموں کی سماعت فرما رہے ہیں ۔پاس دوست یار بیٹھے ہیں دورانِ سماعت ان سے بھی گفتگو جاری رہتی ہے ۔

الفاظ ضلع کچہری کی صحیح تصویر نہیں کھینچ سکتے ۔ یہاں کی فضا الگ ۔یہاں کا ماحول الگ ۔ یہاں کی زبان الگ ۔ یہاں کی اصلاحات الگ ۔عجیب وغریب جگہ ہے ۔خدا اس سے دور ہی رکھے ۔

آپ کو نقل لینی ہو تو درخواست کے ساتھ "پہیئے" لگانے پڑیں گے ۔کوئی مثل معائنے کے لیئے نکلوانی ہو تو بھی "پہیئے" لگانے پڑیں گے کسی افسر سے ملنا ہو تو بھی "پہیئے" لگانے پڑیں گے ۔ اگر کام فوری کرانا ہو تو پہیوں کی تعداد بڑھ جائے گی ۔غور سے دیکھنے کی ضرورت نہیں ۔اگر آپ کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں تو آپ کو ضلع کچہری میں ہر عرضی پہیوں پر چلتی نظر آئے گی ۔ ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک چار پہیئے ۔ دوسرے دفتر سے تیسرے دفتر تک جانے کے لیئے آٹھ پہیئے وقس علیٰ ہٰذا ـــــ اگر آپ عادی مجرم نہیں تو آپ کے دل میں یہ زبردست خواہش پیدا ہوگی کہ کوئی آپ کے پہیئے لگادے اور دھکا دیدے تاکہ آپ ضلع کچہری سے باہر نکل جائیں ۔

وکیل کا سوال درپیش تھا ۔عدالت میں حاضر ہونے سے پہلے جناب تصدق حسین خالد سے ملاقات ہوئی ۔ آپ نے کمال مہربانی سے خود ہی کہا کہ وہ ہمارے مقدمے کی پیروی کرنے میں مسرت محسوس کریں گے ۔چنانچہ ان کو ہی تکلیف دی گئی ۔

خالد صاحب آئے ۔ ہم ملزمین میاں اے ایم سعید پی سی ۔ایس مجسٹریٹ درجہ اول کی عدالت میں پیش ہوئے ۔ میاں صاحب موصوف کسی زمانے میں کپتانی کے عہدے

پر فائز تھے۔ مگر اب ان سے بندوق لیکر عدل و انصاف کی ترازو ان کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں۔ چھریرا بدن رنگ سانولا۔ کرسی پر بڑی تمکنت سے بیٹھے تھے۔ ہم ملزمین سلام کر کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے تو آپ ہماری طرف دیکھے بغیر میاں تصدق حسین خالد کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک بار پھر ضمانتیں ہوئیں۔ اس کے بعد دوسری سماعت کی تاریخ مل گئی۔ ہم نے میاں سعید صاحب کو سلام کیا اور عدالت سے باہر نکل آئے۔ جون کا مہینہ تھا۔ سب کے حلق خشک تھے۔ مگر عارف عبد المتین کا حلق بالکل لکڑی ہو رہا تھا۔ کاش وہاں کوئی پارٹی ممبر ہوتا۔

دو تین پیشیاں اس طرح بھگتے۔ موسم ظالمانہ حد تک گرم ہو چکا تھا۔ لیکن "قہر درویش برجان درویش" آواز پڑنے تک عدالت کے باہر کھڑے رہتے۔ کیونکہ ڈر تھا کہ اگر ہم اِدھر اُدھر ہو گئے تو مجسٹریٹ صاحب کا قہر نازل ہو جائے گا۔ شروع ہی سے ان کا رویہ بہت سخت تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے اپنے دل میں ہمارے خلاف فیصلہ مرتب کر چکے ہیں۔ میاں خالد نے مجھ سے کہا "کیوں نہ ہم اس عدالت سے اپنا مقدمہ منتقل کرا لیں۔ مجسٹریٹ کا رویہ مخاصمانہ ہے" میں نے کہا "میاں صاحب چھوڑیئے۔ دوسری عدالت میں مقدمے گئے تو کیا ہمیں وہاں لڈو پیڑے کھلائے جائیں گے۔ رہنے دیجئے مقدمے کو یہیں۔"

میاں خالد مان گئے۔ چنانچہ دو تین پیشیاں بھگتے۔ استغاثے کی طرف سے مسٹر محمد یعقوب ولد میاں غلام قادر منیجر کپور آرٹ پریس لاہور۔ شیخ محمد طفیل حلیم اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ڈی سی آفس لاہور۔ سید ضیاء الدین احمد مترجم پریس برانچ پنجاب گورنمنٹ اور چند اور حضرات رسمی طور پر پیش کیے گئے۔

سید ضیاء الدین نے کہا کہ میری رائے میں "ٹھنڈا گوشت" تمام کا تمام فحش ہے

میاں خالد نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جہاں تک مصنف کی کوشش کا تعلق ہے وہ نیک ہے۔ مگر اندازِ اظہار اور استعمال الفاظ غلط ہے۔ میاں خالد نے گواہ سے ایک اور سوال کیا: کیا مصنف کو اپنے کردار کے منہ میں ایسے الفاظ نہیں ڈالنے چاہئیں جو اس کی صحیح شخصیت پیش کریں؟ سید صاحب نے جواب دیا جس قسم کا کردار ہو ویسے ہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں۔ سید صاحب نے یہ بھی تسلیم کیا کہ مصنف کا یہ کام ہے کہ وہ اچھے برے کردار تخلیق کرے۔

شہادتِ استغاثہ ختم ہوئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے محض ضابطے کے طور پر ہم سے چند سوال کیے جن کا مختصر جواب دے دیا گیا۔ یہ سلسلہ عدالتی زبان میں "استفسارِ ملزم بلا حلف" کہلاتا ہے اور کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔

سوالِ عدالت۔ آپ پر الزام ہے کہ آپ نے بحیثیت مصنف مضمون "ٹھنڈا گوشت" جو کہ رسالہ "جاوید" کے خاص نمبر میں بغرضِ اشاعت نصیر انور پرنٹر پبلشر ملزم ہمراہی اور عارف عبدالمتین اور نصیر انور اڈیٹر رسالہ مذکور کو جو کہ فحش تھا دیا۔ یہ جرم زیرِ دفعہ ۲۹۲ تعزیراتِ ہند کی تعریف میں آتا ہے۔ آپ وجہ ظاہر کریں کہ کیوں نہ آپ کو اس جرم کی سزا دی جائے؟

جواب۔ (جو خالد صاحب نے میری طرف سے دیا) میں نے افسانہ "ٹھنڈا گوشت" جاوید میں بغرضِ اشاعت دیا۔ لیکن وہ فحش نہیں تھا اور نہ میں اسے فحش تصور کرتا ہوں۔ یہ افسانہ اصلاحی ہے۔

سوالِ عدالت۔ مقدمہ کیوں بنایا گیا؟

جواب۔ پولیس بہتر جانتی ہے۔ اس کا نقطۂ اخلاق و اصلاح ہم سے مختلف ہے۔

سوالِ عدالت۔ کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟

جواب۔ بس مزید کچھ نہیں۔

اب ہم سے صفائی کے گواہوں کی فہرست پیش کرنے کے لئے کہا گیا۔ یہ فہرست ہم نے پہلے ہی سے تیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ فوراً پیش کر دی گئی۔ میاں سعید صاحب نے جب تیس نام دیکھے تو خفا ہو گئے۔ کہا: "میں اتنا ہجوم نہیں بلا سکتا" میاں خالد نے اصرار کیا کہ ہر گواہ اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ میاں سعید نے اپنے انداز میں مضحکہ اڑانے کی کوشش کی۔ ممتاز شیریں صاحبہ کا نام پڑھا تو ارشاد کیا: "یہ ممتاز شانتی کون ہے؟" عدالت کے آدمی میاں صاحب کے اس مذاق پر ہنسے ہم ہونٹ بھینچے خاموش رہے۔

بڑی منتوں کے بعد مجسٹریٹ صاحب درجہ اول چودہ گواہ بلانے پر راضی ہوئے۔ چنانچہ فہرست پر نشان لگا دیئے گئے سمن جاری ہوئے میں کسی گواہ سے نہ ملا۔ کیونکہ میں چاہتا تھا کہ ہر ایک میرے افسانے کے متعلق اپنی بے لاگ رائے دے تاکہ مجھے اپنی صحیح پوزیشن معلوم ہو سکے۔

جن گواہوں کے سمن کی تعمیل ہو چکی تھی ان کو صبح سویرے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ میں بے حد شرمندہ تھا کیونکہ غریب کام کاج چھوڑ کر کئی کئی گھنٹے کھڑے رہتے تھے۔ ہم تو ملزم تھے لیکن ان کی حالت بھی ہم جیسی تھی۔ ہم اندر کٹہرے میں کھڑے رہتے تھے۔ اور وہ عدالت کے باہر لوہے کے جنگلے کے ساتھ لگے انتظار کرتے رہتے تھے کہ انہیں کب آواز پڑتی ہے۔

میرے دوست شیخ سلیم کی حالت قابلِ رحم تھی۔ صبح شام پینے کا عادی۔ سارا وقت جمائیاں لیتا رہتا تھا۔ آخر اس سے یہ اذیت برداشت نہ کی گئی۔ چھوٹی بوتل میں وہسکی بھر کے لے آتا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پیتا رہتا۔ اور یوں اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن جب دوسروں سے باتیں کرتا تو یہی کہتا "آخر فحاشی ہے کیا۔ منٹو کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" میں نے پڑھا

نہیں لیکن یہ فحش نہیں ہو سکتا۔ منٹو آرٹسٹ ہے۔"

ہماری طرف سے پہلے گواہ سید عابد علی عابد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پرنسپل دیال سنگھ کالج لاہور تھے۔ آپ نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ میں نے رسالہ "جاوید" میں "ٹھنڈا گوشت" پڑھا ہے ۔۔ یہ ایک ادب پارہ ہے ۔۔ منٹو صاحب کی میں نے تمام تصانیف پڑھی ہیں۔ پریم چند کے بعد جو مختصر افسانہ نگار مشہور ہوئے ان میں سعادت حسن منٹو کو ایک خاص مقام حاصل ہے ۔۔ اس افسانے سے ایشر سنگھ کے کردار کا نمایاں ترین اثر یہ ہے کہ اس نے جو ناروا حرکت کی۔ اس کی سزا اسے فطرت کی طرف سے نفسیاتی طور پر مل گئی۔"

عدالت کے ایک سوال پر عابد صاحب نے کہا "دلی سے لیکر غالب تک سب وہ چیز جسے فحش کہا جاتا ہے۔ لکھتے چلے آئے ہیں۔ لٹریچر کبھی فحش نہیں ہوتا جو ایک بار لٹریچر قرار دیا جا چکا ہو۔"

استغاثہ کی طرف سے سوال کیا گیا "کیا ادب مقصود بالذات ہے؟"

عابد صاحب نے جواب دیا "میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ادب تنقید حیات ہے اور اس میں اس سوال کا جواب شامل ہے۔ ہر معقول انسان کے قول اور فعل کا مطلب ہوتا ہے۔ لیکن تمام انسان معقول نہیں ہوتے۔ ہر قول یا فعل سوسائٹی کی نظروں میں اچھا یا برا ہو سکتا ہے۔ اچھے اور برے فعل جانچنے کے لئے بے شمار معیار ہوتے ہیں"

استغاثے کے ایک اور سوال کے جواب میں عابد صاحب نے کہا "یہ افسانہ میرے سب بچوں اور بچیوں نے پڑھا ہے۔ میری ایک لڑکی جو فورتھ ایئر میں پڑھتی ہے اس سے کئی بار "سیکس" پر علمی بحث ہو چکی ہے۔ جو اس کے نصاب کا جزو ہے۔" پھر آپ نے کہا "خاص آدمیوں سے جو کہ ادیب ہیں اس افسانے کے بارے میں میرا تبادلۂ خیالات ہوا۔ سب نے اس کو بہت سراہا۔"

صفائی کے دوسرے گواہ مسٹر احمد سعید پروفیسر نفسیات دیال سنگھ کالج لاہور تھے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا کہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" فحش نہیں ہے۔ اس میں ایک بہت بڑا جنسی مسئلہ ہے۔ ان کے نزدیک لفظ فحش کی کوئی بنیادی نہیں دوسرے الفاظ میں فحاشی ایک اضافی چیز ہے۔ ذہنی طور پر بیمار اشخاص پر "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے سے بُرا اثر ہو سکتا ہے۔

تیسرے گواہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی سابق ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کشمیر تھے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا "انسانی نفسیات کے اندر جو خیر و شر ہے، ادیب کا یہ کام ہے کہ وہ اس کو اس انداز سے پیش کرے کہ جس سے انسانی زندگی کے حقائق سمجھنے میں مدد مل سکے۔ بُرے کردار کو اس انداز سے پیش کرے کہ اس کی بُرائی دیکھ کر نفرت پیدا ہو۔"

خلیفہ صاحب نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا زیر بحث افسانے کے کردار ایشر سنگھ سے شدید کراہت اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کردار بالکل صحیح ہے۔ ایسے کرداروں پر خاص کیفیتوں کے ماتحت جسمانی حالت درست ہونے کے باوجود نفسیاتی بیماری ہو سکتی ہے۔"

ان تین گواہوں کے بیان ایک پیشی میں ہوئے چونکہ یہ خاصے طویل تھے اور ایک ایک لفظ خود مجسٹریٹ صاحب کو لکھنا پڑتا تھا اس لیے وہ جھنجھلا جھنجھلا جاتے تھے۔ کئی بار آپ نے تنگ آ کر کہا "میں مجسٹریٹ ہوں یا محرر؟" لیکن بہرحال انہیں اپنا فرض ادا کرنا ہی پڑتا تھا۔

اس پیشی میں ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ میرے ہاتھ میں سگرٹوں کا ڈبہ غالباً کریون اے کا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب کی نظر پڑی تو آپ نے مجھے ایک بہت بڑی ڈانٹ پلائی "یہ گھر نہیں ہے ۔۔۔ عدالت ہے۔" میں نے مؤدبانہ عرض کیا لیکن

حضور میں پی تو نہیں رہا ہوں "۔ آپ نے اور زیادہ گرم ہو کر کہا " خاموش رہو۔ ڈبہ اپنی جیب میں رکھو "۔ میں نے حکم کی تعمیل کی ۔۔ مجسٹریٹ صاحب درجہ اوّل نے میز پر سے اپنا سگریٹ کا ٹن اٹھایا اور ایک سگریٹ سلگا کر پینا شروع کر دیا ۔۔ اور میں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا اس کا بکھرا ہوا دھواں پیتا رہا۔

اگلی پیشی پر میاں تصدق حسین خالد تشریف نہ لائے۔ کیونکہ ان کے گھر میں کوئی علیل تھا۔ یہیں تاریخ مل گئی۔ اس تاریخ پر بھی میاں صاحب موصوف تشریف نہ لائے۔ ان کا لڑکا ولایت سے واپس آ رہا تھا۔ وہ کراچی اس کے استقبال کے لیئے چلے گئے تھے۔ ہم سخت الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ میں نے مجسٹریٹ صاحب سے مؤدبانہ گذارش کی۔ کہ ہمیں تاریخ دے دی جائے اس لیئے کہ ہمارا وکیل موجود نہیں ۔۔ آپ نے اس سے انکار کر دیا۔ اور حکم دیا کہ کارروائی شروع ہو۔

میں بہت سٹپٹایا۔ گواہ کو آواز دی گئی۔ ڈاکٹر سعید اللہ ایم۔ اے ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی ایس سی (ان دنوں پاکستان ایئر فورس کے سولین آفیسر) تشریف لائے۔ اب میں سوچنے لگا کیا کروں۔ مگر شاید اس لیئے کہ خاندان کے سب بزرگ وکیل اور باپ سب جج تھے۔ دو بڑے بھائی بیرسٹر ہیں اور اس لحاظ سے خون میں کسی قدر قانون گھلا ہوا تھا۔ میں نے میاں تصدق حسین صاحب خالد کی جگہ سنبھال لی۔ اور اپنے گواہ نمبر ۲ ڈاکٹر سعید اللہ صاحب سے بیان دلوانا شروع کر دیا۔ بات بات پر مجسٹریٹ صاحب مجھے ٹوکتے "تم اس طرح سوال نہیں کر سکتے ۔۔ تم یہ بات نہیں پوچھ سکتے ۔۔" میں ڈٹا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کا آدھا بیان ختم ہوا تھا کہ عدالت کے کمرے میں چار نوجوان وکیل کالے کوٹ پہنے بڑے چست۔ بڑے بانکے داخل ہوئے اور ڈاکٹر سعید اللہ صاحب کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ایک جس کی پتلی پتلی مونچھیں تھیں اور جس کا رنگ

باقی دو کے مقابلے میں کسی قدر سانولا تھا۔ میرے ساتھ کٹہرے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجھے سانس لینے کا موقعہ ملا تو اس نے میرے کان میں کہا: "منٹو صاحب کیا ہم آپ کے مقدمے کی پیروی کر سکتے ہیں؟" میں نے کچھ نہ سوچا اور کہا: "جی ہاں آپ کر سکتے ہیں؟" چنانچہ پتلی پتلی مونچھوں والے اس نوجوان وکیل نے پیروی شروع کر دی۔ مجسٹریٹ صاحب نے اس سے پوچھا۔ "آپ کیسے؟"

وکیل نے مسکرا کر جواب دیا: "حضور میں ان کا وکیل ہوں۔ کیوں منٹو صاحب؟"
—— میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کارروائی شروع ہوئی۔ اس وکیل کے باقی تین ساتھی بھی حصہ لینے لگے۔ ان کی سرگرمی میں بڑا دلکش لڑکپن تھا۔ وہ جو کالج کے زندہ دل طلباء میں ہوتا ہے۔ مجسٹریٹ بھنا گئے۔ آپ نے ان تین سے پوچھا: "آپ حضرات کیوں بیچ میں بول رہے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا: "حضور ہم ملزموں کے وکیل ہیں۔ کیوں منٹو صاحب؟" میں نے پہلے کی طرح سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر سعید اللہ صاحب نے اپنے بیان میں جو کچھ کہا میں اسے مختصراً پیش کرتا ہوں۔
—— آپ نے فرمایا: "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے کے بعد میں خود ٹھنڈا گوشت بن گیا۔ پژمردگی اور افسردگی یہ تھا اس کا اثر۔ یہ افسانہ ہیجان ہرگز پیدا نہیں کرتا ایشر سنگھ کا کردار پیش کرنے کے لیے مصنف نے دو تین دفعہ گالی استعمال کی ہے۔ مگر شاید فنکار نے اسے مناسب سمجھا ہو۔ مگر گالی کی شکل اس نے اس طرح بدلی ہے کہ گالی معلوم نہیں ہوتی۔ اگر وہ گالی جو ایشر سنگھ نے استعمال کی ہے۔ گالی بھی رہتی تو بھی میرے نزدیک افسانہ فحش نہ ہوتا۔ گالی فحش بھی ہو سکتی ہے اور فحش نہیں بھی ہو سکتی۔ اگر فن کار صحیح فن کار ہے تو وہ گالی کو بغیر ضرورت کبھی استعمال نہیں کرتا اس افسانے میں گالی کا استعمال فن کارانہ ہے۔"

پروسی کیوڑ صاحب بڑے نستعلیق قسم کے آدمی تھے۔ بہت بانکے۔ کجکلاہ۔ گردن میں ہلکا سا شاندار خم آنکھوں پر "رم لیس" چشمہ جسے وہ بار بار اپنی ناک سے اتارتے اور چڑھاتے تھے۔ آپ نے ازراہ تمسخر کچھ کہا تو ڈاکٹر صاحب ہنس پڑے اس زور سے کہ دوسرے کمرے میں صوفی تبسم صاحب کرسی پر اچھل کر باہر نکل آئے بہرحال معاملہ ٹل گیا۔

پروسی کیوڑ صاحب نے جن کا نام غالباً محمد اقبال تھا ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "نفسِ مضمون کے لحاظ سے مختلف ادبا کو مختلف القاب دیئے گئے ہیں۔ مثلاً راشد الخیری کو مصورِ غم۔ اقبال کو مصورِ حقیقت اور خواجہ حسن نظامی کو مصورِ فطرت ...... آپ ..... ؟

ڈاکٹر صاحب نے اقبال کی بات کاٹ کر کہا: "میں "ٹھنڈا گوشت" کے مصنف کو مصورِ حیات کا لقب دوں گا۔"

اب کرنل فیض احمد فیض ایڈیٹر پاکستان ٹائمز کی باری آئی۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا: "میری رائے میں افسانہ فحش نہیں ہے۔ کسی افسانے کے الگ الفاظ کو فحش یا غیر فحش کہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ افسانے پر تنقید کرتے وقت مجموعی طور پر تمام افسانہ زیرِ نظر ہونا اور ہونا چاہیئے۔ محض عریانی کسی چیز کے فحش ہونے کی دلیل نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس افسانے کے مصنف نے فحش نگاری نہیں کی لیکن ادب کے اعلیٰ تقاضوں کو بھی پورا نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں زندگی کے بنیادی مسائل کا تسلی بخش تجزیہ نہیں ہے۔"

جرح کے جواب میں فیض صاحب نے کہا: "اگر موضوع تقاضہ کرے تو میں ایسے الفاظ کا استعمال جائز سمجھتا ہوں۔ اگرچہ یہ الفاظ پارلیمنٹری نہیں، لیکن ادبی اعتبار سے جائز ہیں۔"

فیض صاحب کے بعد صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور تشریف لائے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا: "افسانہ "ٹھنڈا گوشت" لوگوں کے اخلاق کو خراب نہیں کرتا۔ ہوسکتا ہے اس کے بعض فقرے الگ ہوکر فحش ہوں اور بعض نہ ہوں۔ انسانی جنسیات کو ادب کا موضوع بنا کر ہمارے لٹریچر کا رجحان ایک صحیح سمت کی طرف جا رہا ہے۔"

جرح کا جواب دیتے ہوئے صوفی صاحب نے فرمایا: "کوئی افسانہ یا ادب پارہ فحش نہیں ہوسکتا جب تک لکھنے والے کا مقصد ادب نگاری ہے۔ ادب بحیثیت ادب کے کبھی فحش نہیں ہوتا۔"

اقبال صاحب نے اپنی ناک پر سے کئی مرتبہ جلدی جلدی "رم لس" چشمہ اتارا اور جمایا وہ صوفی صاحب کو گھیر گھار کر اپنے مطلب کی بات کہلوانا چاہتے تھے۔ مگر صوفی صاحب طفل مکتب نہیں تھے۔ بیس برس سے اُستادی کرتے چلے آئے تھے اقبال صاحب کے جال میں نہ پھنسے۔ ایک مرتبہ تو آپ نے صاف کہہ دیا۔ "دیکھئے صاحب آپ لاکھ الٹ پھیر کریں لیکن میں وہی کچھ کہوں گا جو مجھے کہنا ہے۔"

اقبال صاحب نے سوال کیا: "اگر کسی تحریر افسانے یا ادب پارے کے نتائج مخرب الاخلاق ہوں مگر مصنف کا مقصد تخریب اخلاق نہ ہو تو آپ اس افسانے کو فحش کہیں گے یا نہیں؟"

صاف ظاہر تھا کہ اقبال صاحب کیا چاہتے ہیں۔ صوفی صاحب نے مسکرا کر جواب دیا: "نہیں۔۔۔ اس لیے کہ پڑھنے والوں کے اپنے ذہنی رجحانات شامل ہوں گے نہ کہ مصنف کا مطلب۔ تخلیق ادب مصنف اپنی طبع سے مجبور ہو کر کرتا ہے یہ تخلیق اوروں کے لیے بھی ہوتی ہے۔"

اقبال صاحب نے ایک اور سوال کیا: "اگر اس تصنیف سے لوگوں کے

اخلاق پر بُرا اثر پڑے تو اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوگی یا نہیں ؟
صوفی صاحب نے کھٹ سے جواب دیا : وہ بری الذمہ ہے ؟
اقبال صاحب نے عاجز آکر پوچھا "آخر مخرب اخلاق تحریر کیا ہے ؟
صوفی صاحب نے جواب دیا " وہ تحریر جس سے لکھنے والے کا مقصد محض تخریب اخلاق ہو ؟

اقبال صاحب نے ناک پر اپنا " رم لس " چشمہ جمایا اور گردن کو ذرا اور خمیدہ کرکے جرح بند کردی۔

ڈاکٹر آئی ۔ لطیف ہیڈ آف دی سائیکولوجی ڈیپارٹمنٹ ایف سی کالج لاہور بلائے گئے ۔ میں نے ان کا نام سُنا تھا لیکن دیکھا کبھی نہیں تھا۔ آپ صوفی صاحب کے بیان کے دوران میں میاں سعید صاحب کے پاس بیٹھے تھے اور رسالہ "جاوید" کا خاص نمبر ان کے ہاتھ میں تھا ۔ میں نے ان کی طرف غور ہی نہیں کیا تھا۔ جب وہ بیان دینے لگے تو میں نے انہیں غور سے دیکھا ۔ کالا رنگ ۔ سب سے پہلے مجھے ان کی تیکھی مونچھیں نظر آئیں ۔ آپ نے رسالہ ایک طرف رکھا اور کہنا شروع کیا " میں نے " ٹھنڈا گوشت " ابھی ابھی پڑھا ہے ۔ یہ ایک غلط رسالے میں چھپا ہے ۔ میرا مطلب ہے یہ افسانہ ایک پوپولر رسالے میں نہیں چھپنا چاہئے تھا ۔ اگر یہ کسی سائینٹفک رسالہ میں کیس ہسٹری کے طور پر ایسے الفاظ تائید یا تردید میں چھپتے تو اس پر فحاشی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا تھا ۔ جن الفاظ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ بولنے میں ان کو بُرا سمجھتا ہوں لیکن کیس ہسٹری میں یہ الفاظ بڑی اہمیت رکھینگے ؟

خدا معلوم کیا بات ہوئی کہ ڈاکٹر لطیف نے ایک دم پوچھا " مسٹر منٹو کون ہیں ؟ میں نے کہا جناب یہ خاکسار ہے " ۔ ڈاکٹر صاحب کی تیکھی مونچھیں تھرتھرائیں ۔ آپ نے مجھ سے کچھ نہ کہا اور بیان دینے میں مشغول ہو گئے ۔ وکیل صاحب نے میرے

کان میں کہا : "منٹو صاحب آپ کا یہ گواہ تو ہوسٹائل ہوگیا ہے۔ اب آپ اس پر جرح کر سکتے ہیں"
میں نے کہا : "ہٹایئے"
لیکن وکیل صاحب نے جرح کر ہی دی ۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر لطیف صاحب نے کہا : "افسانہ ایسے رسالے میں جس کو ہر بچہ بوڑھا ۔ لڑکا لڑکی پڑھ سکے نہیں چھپنا چاہیئے تھا کیونکہ ایسی طبائع جو جذبات کو مشتعل کرنے والے تاثرات قبول کرنے والی ہوں یہ افسانہ پڑھ کر مشتعل ہوں گی"
جرح ختم ہوئی ۔ ڈاکٹر لطیف صاحب میرے پاس آئے ہاتھ ملایا اور کہا "آپ نے مجھے گواہی کے لیئے بلایا تھا تو کم از کم مل لیئے ہوتے" میں نے مسکرا کر جواب دیا "انشاءاللہ اب ملاقات کا شرف حاصل کروں گا"
ڈاکٹر صاحب نے پھر ہاتھ ملایا اور چلے گئے ۔
اب میں ان چار نوجوان وکیلوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو بڑے ڈرامائی انداز میں میرے مقدمے میں داخل ہوئے تھے ۔ پتلی پتلی مونچھوں، تیکھی ناک اور سانولے رنگ والے شیخ خورشید احمد تھے ۔ کافی ہاؤس ان کے بغیر نامکمل ہے ۔ دوسرے تین تھے ۔ مسٹر مظہر الحق، مسٹر سردار محمد اقبال اور مسٹر اعجاز محمد خاں ۔ آپ لوگوں کو بار روم میں معلوم ہوا کہ میں خود اپنا کیس کنڈکٹ کر رہا ہوں اور پریشان ہوں تو وہ میری مدد کے لیئے چلے آئے ۔۔۔ میں نے ان کا شکریہ مناسب و موزوں الفاظ میں ادا کیا ۔
شیخ خورشید احمد نے کہا : "اس کی کوئی ضرورت نہیں ۔ لیکن داد دیجیئے کہ میں نے آپ کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھا کیا دیکھا تک نہیں"
ہم سب خوب ہنسے ۔ شیخ نے کہا : "اور میں شرط لگانے کے لیئے تیار ہوں

کہ مسٹر اقبال نے بھی یہ افسانہ ابھی تک نہیں پڑھا۔"

ہماری طرف سے سات گواہ اب تک پیش ہوئے تھے بقایا گواہوں کو بلانے کے لیے جب شیخ خورشید صاحب نے عدالت سے درخواست کی تو منسوخ کر دی گئی مجسٹریٹ صاحب نے اس خیال سے کہ ہمارا پلڑا وزنی ہے۔ عدالت کی طرف سے چار گواہ طلب کیے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی۔ شورش کاشمیری، ابوسعید بزمی اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔

کئی تاریخیں بھگتیں مگر یہ حضرات جمع نہ ہوسکے۔ آخر ایک تاریخ پر سب آگئے۔ تاجور صاحب سے علیک سلیک ہوئی تو آپ نے لیکچر پلانا شروع کر دیا کہ میں ایسے غلیظ فحش اور واہیات افسانے لکھتا ہوں۔ میں خاموش سنتا رہا اس لیے کہ مولانا کے ساتھ بحث کرنا فضول تھا۔

آغا شورش بڑے پُر شور طریقے پہ ملے۔ ابوسعید بزمی نے مجھ سے ایک سگرٹ لیا اور سلگا کر ٹہلنے لگے۔ آواز پڑی تو حاضر عدالت ہوئے۔ کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے گواہ منجانب عدالت شمس العلما، مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور تھے۔۔۔ آپ نے فرمایا" ٹھنڈا گوشت" کسی مسجد میں کسی مجلس میں جماعتی حیثیت میں سننا پسند نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی پڑھے تو سر ملامت لے کر نہ جا سکے۔ چالیس سالہ ادبی زندگی میں ایسا ذلیل اور گندہ مضمون میری نظر سے نہیں گذرا۔

میں نے مولانا سے چند سوال کیے تو آپ نے جواباً کہا" یہ افسانہ میں نے پہلی بار دیال سنگھ کالج میں پڑھا لیکن پورا نہیں پڑھا۔ تھوڑا سا پڑھا اور لغو سمجھ کر بند کر دیا۔ مثنوی گلزار نسیم میں بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی کا تذکرہ اخلاق سے متصادم ہے۔۔۔ فسانۂ عجائب۔ مثنوی بہار عشق۔ مثنوی فریب عشق اور الف لیلیٰ میں جو

فحش حصے ہیں وہ فحش ہیں۔ حکایت خاتم وکنیز کا ذکر مثنوی مولانا روم میں آتا ہے لیکن میں نے نہیں پڑھا۔ جنسی ترغیب کا پہلو مثنوی مولانا روم میں نہیں ہو سکتا"۔
جی چاہتا تھا کہ مولانا کو خوب ستاؤں مگر میں نے مناسب خیال نہ کیا اور چند سوال اور کر کے ان کو چھوڑ دیا ۔۔۔ اب آغا شورش کاشمیری ولد آغا نظام الدین اڈیٹر ہفتہ وار "چٹان" مونچھوں کے اندر مسکراہٹیں بکھیرتے تشریف لائے۔ میری طرف دیکھ کر آپ کھل کے مسکرائے اور بیان دینا شروع کر دیا۔
آپنے فرمایا: "جہاں تک میرے علم اور احساسات کا تعلق ہے میں نے "ٹھنڈا گوشت" سے اچھے تاثرات فراہم نہیں کیے میں جس سماج اور گھر لنے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس کے پیش نظر میں ایسا مضمون اپنے پرچے میں شائع نہیں کردں گا میارمدرسۂ فکر اسے گوارا نہیں کرتا"۔
استغاثے کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آغا صاحب نے کہا: "اس سے اوباش قاری کو ترغیب ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو جن کا رجحان طبیعت خاص طور پر بدکاری کی طرف مائل ہو"۔
ہماری طرف سے آغا صاحب پر کوئی جرح نہ کی گئی ۔۔۔ ابوسعید بزمی اڈیٹر احسان لاہور پیش ہوئے تو آپ نے افسانے کو مخرب اخلاق قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ "افسانہ معنی ومطلب کی وجہ سے قابل اعتراض ہے"۔
میں نے بزمی سے پوچھا: "کیوں حضرت یہ بتائیے کیا اسی عدالت میں آپ کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چل رہا ہے"۔ آپنے جب "جی ہاں"۔ کہا تو مجسٹریٹ صاحب نے حیرت سے پوچھا: "میری عدالت میں"۔ بزمی صاحب نے پھر جواب دیا: "جی ہاں"۔ مجسٹریٹ صاحب نے قلم سے سر کھجا کر پائپ سلگایا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

آخری گواہ منجانب عدالت پیش ہوئے یعنی ڈاکٹر تاثیر صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا: "کہانی ادبی لحاظ سے ناقص ہے لیکن بے ادبی۔ نشان لگائے ہوئے الفاظ کچھ اس کہانی کے لیئے ضروری ہیں۔ کچھ غیر ضروری۔ کچھ الفاظ ایسے الفاظ ہیں جن کو ناشائستہ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن میں فحش اس لیئے نہیں کہتا کہ لفظ فحش کی تعریف کے متعلق میں واضح نہیں ہوں۔ میرے خیال میں جن لوگوں کا میلان بدکاری کی طرف ہے۔ ان کے لیئے اس مضمون میں جنسی ترغیب موجود ہے جس شخص کی طبع میں میلانِ بدکاری نہ ہو اسے اس مضمون سے جنسی کراہت ہوگی جنسی ترغیب نہیں ہوگی۔ "ٹھنڈا گوشت" کا مطلب مردہ لڑکی ہے۔ میں اس کہانی کو ایک عام جنسی کہانی سمجھتا ہوں یہ جنسی اخلاق خراب نہیں کرتی۔"

عدالت کی تمام کارروائی ختم ہوئی۔ اب فیصلہ باقی تھا جو میاں اے ایم سعید صاحب سماعت کے دوران میں کئی مرتبہ زبانی سُنا چکے تھے۔ شیخ خورشید احمد کو یقین تھا۔ کہ ہم سب کو جرمانہ ہوگا۔ فیصلے کی تاریخ سولہ جنوری رہی سال مقرر ہوئی۔ نصیر انور بالکل بے پروا تھا۔ ساری سماعت کے دوران میں وہ ہنستا مسکراتا رہا۔ عارف عبدالمتین البتہ سارا وقت بہت پریشان رہے۔ ان کی اس پریشانی کا باعث یہ بھی تھا کہ ان کے معمر والد بڑے ہراساں تھے۔

جب صفائی کی گواہیاں ختم ہوئی تھیں تو میں نے اپنا تحریری بیان داخل کیا تھا اس کو پڑھ کر مجھے اچھی طرح یاد ہے مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا تھا: "یہ بیان ہی ملزم کو سزا دینے کے لیئے کافی ہے۔"

یہ بیان حسب ذیل ہے:

میں افسانہ "ٹھنڈا گوشت" مطبوعہ ماہنامہ جاوید لاہور کا مصنف ہوں جو استغاثے کے نزدیک عریاں اور فحش ہے۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ یہ افسانہ کسی بھی نکتۂ نظر

سے ایسا نہیں ہے۔

فحاشی کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور کہا جا سکتا ہے مگر یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ "ادب" ہرگز ہرگز فحش نہیں ہو سکتا۔ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کو اگر ادب کے دائرے سے باہر کر دیا جائے تو اس کے فحش ہونے یا نہ ہونے کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ افسانہ ایک ادیب کی تصنیف ہے جو ادب جدید میں کافی اہمیت رکھتا ہے اس کا ثبوت اس کی تصانیف ہیں اور وہ مضامین ہیں جو قریب قریب ہر ادبی رسالے میں اس کے فن پر شائع ہوئے ہیں۔

اس سے پہلے تین مرتبہ چند افسانوں کے بارے میں شبہ ہوا تھا کہ وہ فحش ہیں۔ چنانچہ مجھ پر مقدمے چلے۔ سزائیں ہوئیں لیکن اپیل کرنے پر ہر بار سیشن کورٹ میں مجھے اور میرے افسانوں کو فحاشی کے الزام سے بری کیا گیا۔

میرے ایک مقدمے کے سلسلے میں مسٹر ایم۔ آر بھاٹیہ اڈیشنل سیشن جج کے فیصلے کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔

"قابلِ غور امر ہے کہ ایسے اشخاص ملزمین کی صفائی میں پیش ہوئے ہیں۔ جو اردو زبان کے عالم ہونے کی حیثیت میں بہت مشہور ہیں مثال کے طور پر خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی، مسٹر کے ایل کپور پروفیسر ڈی اے وی کالج۔ راجندر سنگھ بیدی اور ڈاکٹر آئی لطیف پروفیسر ایف سی کالج جو بطور گواہان پیش ہوئے۔ ان سب کی رائے ہے کہ مضمون (بو) میں ایسی کوئی چیز نہیں جو جنسیاتی حسیات پیدا کرے بلکہ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ مضمون ترقی پسند ہے اور اردو ادب کے ماڈرن رجحان سے تعلق رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ استغاثے کے گواہ نمبر چار رشید نے دوران جرح میں تسلیم کیا کہ مضمون انسان کے اخلاق پر بُرا اثر نہیں ڈالتا۔

ماتحت عدالتِ فاضل نے ہندوستانی نوجوانوں کی تعیش پسند زندگی کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کیا ہے اور اس بات پر ماتم کیا ہے کہ ملک میں ہندوستانیوں کا پرانا کیرکٹر نابود ہو رہا ہے۔ ماتحت عدالت کے فاضل جج نے وہ خوبیاں بھی یاد کرائی ہیں جن کے لیے ہم ہندوستانی کبھی مشہور تھے اور نصیحت کی ہے کہ نئے فیشنوں کو ختم کر دینا چاہیے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماتحت عدالتِ فاضل کے خیالات ترقی پسند نہیں ہیں۔ ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ہے جیسن چیز ایک دائمی مسرت ہے۔ آرٹ جہاں بھی ملے ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ آرٹ خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجسمے کی شکل میں۔ سوسائٹی کے لئے قطعی طور پر ایک پیش کش ہے۔ چاہے اس کا موضوع غیر مستور ہی کیوں نہ ہو یہی کلیہ تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

جب ملک کے مشہور و معروف آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملزمین کے حق میں کہا ہے۔ سارا فیصلہ یہیں ہو جاتا ہے۔ زیر بحث مضمون ایسا نہیں کہ جس پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی کی جائے اس لیے مجھے اپیل منظور کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں۔ جرمانہ اگر ادا کیا گیا ہے تو واپس کیا جائے۔ میں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔"

اس فیصلے سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آرٹ فحش نہیں ہو سکتا ہے اور کسی فن پارے پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی نہیں کی جانی چاہیے۔

کوئی لٹریری پیس یعنی ادب پارہ معیاری یا غیر معیاری ہو سکتا ہے اس لیے کہ آرٹسٹ ہو سکتا ہے اپنا معیار قایم نہ رکھ سکے۔ افسانہ نگار کا ہر افسانہ اس کا شاہکار نہیں ہو سکتا۔

"ٹھنڈا گوشت" کے اسٹینڈرڈ کے بارے میں کہا سنا جا سکتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ افسانہ میرے دوسرے افسانوں کے پائے کا نہیں۔ یہ کام ادبی نقادوں کا ہے اور انہیں اس بات کا حق ہے کہ وہ جانچیں پرکھیں، مگر اس افسانے پر کسی صورت میں بھی فحاشی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لیے کہ مصنف کی طرف سے افسانوں کا ادب میں اچھا برا جیسا بھی ہے یہ ایک اضافہ ہے۔ لیکن اس صورت میں کہ مجھے اپنی پوزیشن صاف کرنا ہے۔ آئیے ہم اس افسانے کو اچھی طرح جانچیں کہ اس میں فحاشی کا کوئی پہلو نکلتا ہے یا نہیں۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" جیسا کہ ظاہر ہے ایک افسانہ ہے جس کا عقبی منظر یوں تو گذشتہ فسادات ہیں۔ لیکن دراصل جس کی بنیاد انسانی نفسیات پر قائم ہے اور انسانی نفسیات کا "جنس" سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

افسانے میں دو کردار ہیں۔ ایشر سنگھ اور کلونت کور۔ دونوں ٹھیٹ قسم کے گنوار سکھ ہیں۔ جب کلونت کور محسوس کرتی ہے کہ ایشر سنگھ تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کی پیار میں پہلی سی بات نہیں رہی۔ وہ اس سے بے رُخی برت رہا ہے۔ کسی اور عورت سے اس نے ناطہ جوڑ لیا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ سردار ایشر سنگھ ایک زبردست نفسیاتی ردِ عمل کا شکار تھا۔ وہ لوٹ مار کے دوران میں قتل و غارت کرنے کے بعد ایک نوجوان مسلم دوشیزہ اٹھا لایا تھا۔ مگر جب اس نے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ لڑکی دہشت کے مارے اس کے کندھوں پر ہی مر چکی تھی۔ اور اس کے سامنے ایک ٹھنڈی لاش پڑی تھی۔ ٹھنڈے گوشت کا لوتھڑا۔ اس کا ایشر سنگھ کو کچھ ایسا زبردست احساس ہوا کہ نفسیاتی طور پر بیکار ہو گیا۔

یہ بات یہاں قابلِ غور ہے کہ قتل و غارت نے اور لوٹ مار نے ایشر سنگھ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ اس نے کئی انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا

مگر اس کے ضمیر پر احساس کی ایک ہلکی سی خراش بھی نہ آئی تھی۔ لیکن جب اُس نے لڑکی کی ٹھنڈی لاش کو دیکھا تو اس واقعہ نے اُسے بدل کر رکھ دیا۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کے بطن میں جو کچھ بھی ہے ظاہر ہے کہ فحش نہیں۔ عنوان ہی ایک بیّن ثبوت ہے۔

ایشر سنگھ کا اندازِ گفتگو اس کا اپنا ہے۔ ہزاروں آدمی عام روزمرہ کی زندگی میں وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جو مصنف نے اس کے منہ سے کہلوائے ہیں۔ اس کی حرکات غیر فطری نہیں۔ اسی طرح کلونت کور کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔

استغاثے کے فاضل وکیل نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ ایشر سنگھ کے مکالموں میں گالیاں استعمال کی گئی ہیں۔ میں یہاں گالی کی نفسیات پر بحث نہیں کروں گا۔ مگر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ الفاظ جو استغاثے کے وکیل کے نزدیک گالی ہیں اصل میں گالی نہیں ہیں۔

"سالا" ہمارے یہاں بہت بڑی گالی تصور کی جاتی ہے لیکن بمبئی میں لفظ "سالا" کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ عام گفتگو میں آپ کو وہاں ایسے کئی فقرے سننے میں آئیں گے۔

"ہمارا باپ سالا بڑا اچھا آدمی تھا"

"سالا ہم سے شٹیک ہو گیا"

"سالا کیسی بات کرتا ہے"

ماں بہن کی گالی یو۔پی اور پنجاب میں گفتگو میں عام استعمال ہوتی ہے اور کسی کے کان کھڑے نہیں ہوتے۔ خاص گالی اکثر لوگوں کا تکیہ کلام بن جاتی ہے۔ ایشر سنگھ بھی چند گالیوں کو تکیہ کلام کے طور پر ہی استعمال کرتا ہے۔ اس لیے

استغاثے کے فاضل وکیل کا اس نکتے پر زور دینا بالکل بیکار ہے۔

اس کے علاوہ یہ اہم بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ایشر سنگھ جیسے اجڈ اور گنوار آدمی سے شائستہ کلامی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے اس کے منہ میں اگر مصنف نے مہذب اور شائستہ الفاظ ڈالے ہوتے تو افسانے میں حقیقت نگاری کا خاتمہ ہو جاتا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ افسانہ ایک نہایت ہی بھونڈی شکل اختیار کر لیتا اور آرٹ کی سطح سے بہت ہی نیچے خرافات کے کھڈ میں گر جاتا۔

سوال ہے جو چیز جیسی ہے اسے ویسی ہی کیوں نہ پیش کیا جائے۔ ٹاٹ کو اطلس کیوں بنایا جائے۔ غلاظت کے ڈھیر کو عود و عنبر کے انبار میں کیوں تبدیل کیا جائے۔ حقیقت سے انحراف کیا بہتر انسان بننے میں مدد و معاون ہو سکتا ہے — ہرگز نہیں — پھر ایشر سنگھ کے کردار اور اس کی گفتار پر اعتراض کیا معنی رکھتا ہے۔

ایشر سنگھ گندہ ذہن سہی۔ افسانہ کا موضوع گھناؤنا سہی۔ لیکن کیا اس کو پڑھنے کے بعد ہمیں انسانیت کی وہ رمق دکھائی نہیں دیتی جو ایشر سنگھ کے سیاہ قلب میں خود اس کا مکروہ فعل پیدا کرتا ہے اور یہ ایک صحت مند چیز ہے کہ اس افسانے کا مصنف انسانوں اور انسانیت سے مایوس نہیں ہوا۔ اگر مصنف نے ایشر سنگھ کے دل و دماغ پر نفسیاتی ردِ عمل پیدا نہ کیا ہوتا تو یقیناً "ٹھنڈا گوشت" ایک نہایت ہی مہمل چیز ہوتی۔

مجھے افسوس ہے کہ وہ تحریر جو انسانوں کو بتاتی ہے کہ وہ انسان سے حیوان بن کر بھی انسانیت سے علیحدہ نہیں ہو سکتے فحش اور جذبات کو ابھارنے والی سمجھی جا رہی ہے۔ اور یہ لطیفہ ہے کہ افسانے میں ایک انسان کو اس کی ری

سبھی انسانیت ایک بہت بڑی سزا دیتی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ ایشر سنگھ کو اپنی چڑی ہوئی گردن کا بال ... اس نہیں تھا۔ اس کو آخری سانس تک صرف ایک ہی بات ستاتی ... ایک ٹھنڈی لاش کو اُٹھالایا تھا۔

فرانس میں مشہور ناول نگار فلا بیر کی تصنیف "مادام بوواری" ... کے الزام میں مقدمہ چلا تو وکیل صفائی موسیو سینارڈ نے ... کے دوران میں کہا۔

"حضرات! یہ کتاب جو بقول وکیل استغاثہ جذبات کو بھڑکاتی ہے موسیو فلا بیر کے وسیع مطالعے اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اس نے اپنی توجہ متین فطرت کی وساطت سے ایسے ہی متین اور موزوں مضامین کی طرف منعطف کی ہے۔ وہ ایسا آدمی نہیں جس کے ... وکیل استغاثہ نے ہیجان خیز تصویروں کی نقاشی کے الزام میں جگہ جگہ اپنی تقریر میں زہر اگلا ہے۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ فلا بیر کی فطرت میں بے انتہا سنگینی شدید سنجیدگی اور بے پناہ ملال بھرا پڑا ہے۔"

میں اپنے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک شریف خاندان کا فرد ہوں۔ اتفاق سے میرا پیشہ تصنیف و تالیف ہے۔ اپنی فطرت اور جو تعلیم و تربیت مجھے ملی ہے اس کی بدولت میں نے آج تک سستا اور سوقیانہ ادب پیش نہیں کیا۔ اردو کے جدید ادب سے جو ذرا سا بھی واسطہ رکھتے ہیں ان کو ... نیتی مقلہ کا علم ہے۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" میں فلا بیر کی فطرت کی بے انتہا سنگینی اور شدید سنجیدگی شاید نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بے پناہ ملال سے معمور ہے اور

جب سوال طال کا ہو تو فحاشی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

اب افسانے کو اس پہلو سے بھی دیکھا جائے کہ مصنف کی نیت کیا ہے۔ رائے صاحب لالہ سنت رام کی عدالت میں اپنے افسانے "دھواں" کے سلسلے میں صفائی کا بیان دیتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

تحریر تقریر میں شعر و شاعری میں سنگ سازی و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لیئے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہیئے اگر یہ ترغیب موجود ہے۔ اگر اس کا ایک شائبہ بھی نظر آ رہا ہے تو وہ تحریر، وہ تقریر، وہ شعر وہ بُت قطعی طور فحش ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی کوئی ترغیب زیر بحث افسانے میں نہیں۔ میں افسانے کا تجزیہ ابھی کر چکا ہوں جو یہ ثابت کرنے کے لیئے کافی ہے کہ مصنف کی نیت میں کوئی فرق نہیں تھا اور اس نے محض ایک نفسیاتی حقیقت کو اس کے صحیح روپ میں افسانے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھ کر اگر کسی صاحب کے جذبات برانگیختہ ہوں تو انہیں کسی ذہنی معالج سے رجوع کرنا چاہیئے۔ افسانہ "دھواں" ہی کی صفائی کے سلسلے ہی میں میں نے اپنے بیان میں کہا تھا۔

"ایک مریض جسم۔ ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے جو لوگ روحانی ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں۔ اصل میں انہیں کے لیئے شاعر شعر کہتا ہے۔ افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصور تصویر بناتا ہے۔"

میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لیئے ہیں نارمل

انسانوں کے لیئے ۔ جو عورت اور مرد کے رشتے کو حیرت کی نظر سے نہیں دیکھتے ۔ بلکہ اس کی صحیح قدروں کو پہچانتے ہیں۔"

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" بھی دوسرے ادب پاروں کی طرح صحت مند دماغوں کے لیئے ہے ۔ ایسے دماغوں کے لیئے نہیں ہے جو معصوم اور پاکیزہ چیزوں میں بھی برائی کرید لیتے ہیں ۔

دنیا میں تو ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو مقدس کتابوں میں بھی بُرائیوں کو ڈھونڈ لیتے ہیں ۔ مگر ایسے لوگوں کا علاج ہونا چاہیئے ۔

امریکہ میں مشہور مصنف جیمز جوئس کی تصنیف "یولی سیز" کو فحاشی سے بری کرتے ہوئے جج وولزلے نے اپنے فیصلہ میں لکھا ۔

> ایک خاص کتاب ایسے جذبات اور خیالات پیدا کر سکتی ہے یا نہیں ۔ اس کا فیصلہ عدالت کی رائے کے ذریعہ یہ دیکھ کر ہوگا کہ اوسط درجے کے جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے ۔ ایسے آدمی پر جسے فرانسیسی "معمولی قسم کی حسیات رکھنے والا انسان" کہتے ہیں اور جس کی حیثیت قانون تفتیش کی اس شاخ میں ایک فرضی عامل کی ہوتی ہے ۔ جیسے عدالتِ خفیفہ کے مقدموں میں "سمجھ بوجھ والے آدمی" کی حیثیت ہوتی ہے ۔ یا رجسٹری کے قانون میں ایجاد کے مسئلے کے متعلق "فن کے ماہر" کی ۔

قانون کا تعلق صرف اوسط درجے کے آدمی سے ہے چنانچہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کے متعلق کوئی فیصلہ مرتب کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کے مطالعے سے ایک اوسط درجے کی جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے ۔

مشہور امریکی ناول نگار ارسکائن کیلڈ ول کی تصنیف "گوڈز لٹل ایکڑ" کو فحاشی کے الزام سے بری کرتے ہوئے عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا۔

مصنف کا مقصد ایک سچی تصویر پیش کرنا تھا۔ ایسی تصویروں میں بعض ضروری تفصیلوں کا آ جانا لابدی امر ہے اور چونکہ ایسی تفصیلوں کا گہرا تعلق زندگی کے جنسی پہلو سے ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں بےباکانہ صاف گوئی کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے عدالت یہ حکم صادر نہیں کر سکتی کہ ایسی تصویریں سرے سے بنائی ہی نہ جائیں۔ کرداروں کی زبان بلاشبہ بھدی اور گندی ہے۔ مگر عدالت مصنف سے ان پڑھ اور غیر مہذب لوگوں کے منہ میں شائستہ زبان ڈال دینے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔"

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" ایک سچی تصویر ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ بڑی بےباکانہ صاف گوئی سے اس میں ایک نفسیاتی حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے اگر اس میں کہیں گندگی اور غلاظت ہے تو اسے مصنف کے ساتھ نہیں بلکہ افسانے کے کرداروں کی ذہنی سطح کے ساتھ منسوب کرنا چاہیئے۔

کسی تحریر کے چند الفاظ اگر چھٹے سے اٹھا کر لوگوں کو دکھائے جائیں کہ فحش ہیں تو اس سے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوگا۔ ان الفاظ کی جداگانہ اشاعت قابلِ گرفت ہو سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے غالب۔ میر۔ ارسٹوفنیز۔ چاسر۔ بوکیشیو بلکہ کتابِ مقدس تک کے بعض مقامات کو قابلِ تعزیر گردانا جا سکتا ہے۔ تاہم کسی تحریر کو سمجھنے کے لیے اسے مجموعی طور پر دیکھنا پڑے گا۔

مجھے آخر میں یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ استغاثے کی طرف سے میری تصنیف "ٹھنڈا گوشت" پر کوئی ادبی تنقید نہیں ہوئی اگر ایسا

ہوتا تو مجھے دلی مسرت ہوتی۔ افسانے میں اگر کوئی فنی کمزوری رہ گئی تھی۔ بیان میں اگر کوئی سقم تھا۔ انشا میں اگر کوئی خامی تھی تو مجھے اس کا علم ہو جاتا اور میں کچھ حاصل کرتا لیکن میں پہلی ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں اور ایک نہایت ہی گھناؤنے الزام کا منہ دیکھ رہا ہوں۔ کہ میں نے اپنی تصنیف کے ذریعہ سے لوگوں کے جذبات ابھارے ہیں ــــ اس کے خلاف میرے دل سے احتجاج کے سوا اور کیا چیز نکل سکتی ہے ــ حیرت ہے کہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھ کر قاری کا ذہن خوف و نفرت میں ملفوف ہونے کے بجائے پراگندہ بھی ہو سکتا ہے۔

اور بھی حیرت ہے کہ ایشر سنگھ کو جو ہولناک سزا ملی وہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں گندے جذبات کیسے بیدار کر سکتی ہے؟

سولہ جنوری آن پہنچی۔ شیخ سلیم بہت پریشان تھا۔ اس پریشانی کے باعث اس نے زیادہ پینا شروع کر دی۔ نصیر انور حسبِ معمول بے پروا تھا۔ عزیزی عارف عبدالمتین کا حلق پہلے سے زیادہ خشک ہو گیا تھا۔

سولہ جنوری کی صبح کو پانچ سو روپے جیب میں ڈال کر میں ضلع کچہری روانہ ہوا۔ شیخ سلیم پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ صبح سے پی رہا تھا۔ بوتل پتلون کی جیب میں تھی۔ خود بہت مضطرب تھا۔ لیکن بار بار مجھے تسلی دیتا تھا "بھائی جان فکر کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں یہ سن کر مسکرا دیتا۔

اتنے میں نصیر انور اور عارف عبدالمتین بھی آ گئے۔ عارف نے مجھ سے بڑے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ "منٹو صاحب۔ آپ کا کیا خیال ہے کیا ہو گا۔" میں نے جواب دیا۔ "وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا۔"

مجسٹریٹ صاحب آ چکے تھے مگر فیصلہ سنانے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ گیارہ بج گئے۔ بارہ بج گئے۔ پانی پی پی کر ہمارے پیٹ اپھر گئے۔

مگر آواز نہ بڑی۔ اتنے میں میرے ایک مخبر نے مجھے بتایا کہ فیصلہ تیار ہے۔ مگر میاں
اسے۔ ایم سعید اس میں شاید کچھ ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پتہ
چلا کہ میاں صاحب غائب ہیں یعنی اپنے کمرے میں موجود نہیں اور یہ کہ انہوں
نے صبح سے کسی مقدمے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

ایک صاحب نے یہ کہا کہ وہ بہت پریشان ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔
تھوڑی دیر کے بعد مخبر نئی خبر لایا۔ ایک طرف لے جا کر اُس نے مجھ سے سرگوشی
میں کہا "میں فیصلہ دیکھ آیا ہوں ـــ جلدی جلدی میں دیکھا ہے۔ صرف چند
آخری سطریں۔ آپ کو یقیناً سزا ہوگی۔ اور جرمانہ بھی ـــ آپ کے نام کے
آگے یہ لکھا تھا۔ And sentence him to undergo ـــ
اس کے آگے جگہ خالی تھی۔ دوسرے ملزموں کو صرف جرمانہ ہوگا۔ میں جاتا ہوں اور
ضمانت کا بندوبست کرتا ہوں"۔

میں سوچنے لگا۔ سزا کتنی ہوگی۔ ایک ماہ کی۔ دو ماہ کی یا چند دنوں کی؟ میں نے
کسی سے بات نہ کی البتہ شیخ خورشید صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔ آپ نے فوراً
ضمانت کے کاغذ تیار کر لیئے اور مجھ سے کہا "گھبرائیے نہیں منٹو صاحب۔ سزا
زیادہ سے زیادہ دس بارہ یوم کی ہوگی" لیکن پھر کچھ سوچ کر تشویش ناک
لہجے میں کہا "لیکن ایسا نہ ہو وہ ضمانت لینے سے انکار کر دے"

یہ سن کر مجھے بہت تشویش ہوئی۔ کیونکہ مجسٹریٹ صاحب کا رویہ شروع
ہی سے مخاصمانہ رہا تھا۔ لیکن کچھ کہا بھی تو نہیں جا سکتا تھا۔ خاموش دل ہی
دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے شیخ سلیم کو
ساری بات بتا دی۔ میرے جی کا بوجھ تو کسی قدر ہلکا ہوگا۔ مگر شیخ بے چارہ اور
زیادہ مضطرب ہو گیا۔ لیکن تسلی دینے کی خاطر مجھ سے کہا "کچھ فکر نہ کرو بھائی جان"۔

— میں ٹیکسی لیکر وہاں جیل میں پہنچوں گا — روپیہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں ایسے معاملے نپٹرنا جانتا ہوں — میرا خیال ہے آپ اس وقت ایک بڑا پیگ لگا لیجیئے"

میں نے کہا:" نہیں شیخ صاحب — شام کو"

شیخ صاحب نے کہا:" تو آپ مطمئن رہیں، میں آپ کو وہاں پہنچادوں گا"

یہ سُن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی — ایک بج چکا تھا۔ شیخ سلیم۔ نعیم انور اور میں نے گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کے سامنے گھاس کے میدان پر بیٹھ کر "آلو چھولے" کھائے اور اس خیال سے کہ کہیں آواز نہ پڑ جائے جلدی لوٹ آئے اور فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔

نعیم انور اور عارف عبدالمتین سے میں نے اشارتاً کئی بار کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے جیل میں ملنے کا بندوبست کرلیں تاکہ عین وقت پر پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ شیخ سلیم پی پی کر اسکیمیں سوچ رہا تھا کہ وہ جیل میں مجھ تک کیسے پہنچے گا اور میری آسائش کا بندوبست کن ذرائع سے کرے گا۔

عزیزی مشتاق احمد اپنے ایک دولتمند دوست شریف صاحب کو میری ضمانت دینے کے لیئے پکڑ لائے تھے۔ یہ غریب بھی ہماری طرح کھڑے بور ہو رہے تھے۔ شیخ سلیم کو غصّہ تھا کہ جب وہ موجود ہے تو کوئی اور ضمانت دینے کے لیئے کیوں لایا گیا۔ میں نے اُن سے کہا:" شیخ اگر آپ کو ضمانت دینے ہی کا شوق ہے تو دو ملزم اور موجود ہیں"۔ شیخ صاحب اس وقت اچھے موڈ میں تھے۔ میری یہ بات سُن کر مسکرا دیئے اور ایک پیگ چڑھا کر اسکیمیں سوچنے میں محو ہوگئے! ان کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ منٹو کی شام خراب ہو جائے گی۔

پانچ بج گئے۔ تشویش اور تردد بڑھتا گیا۔ نصیر بالکل بے پرواہ تھا۔ جیسے کچھ

ہونے والا ہیں۔ اس کی یہ بے پروائی قابلِ رشک تھی۔ عارف عبدالمتین کا حلق اب اتنا خشک ہو چکا تھا کہ اس نے بولنا بند کر دیا تھا ـــــ ساڑھے پانچ ہوئے تو ہمیں بلایا گیا۔ دریا شیخ خورشید صاحب کو اطلاع دی گئی۔ وہ بھاگے بھاگے آئے ... حاضرِ عدالت ہوئے۔

میاں اے۔ ایم سعید دانتوں تلے قلم دبائے۔ سامنے میز پر فیصلے کے کاغذ رکھے سوچ میں غرق بیٹھے تھے۔ شیخ خورشید کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بے حد مضطرب ہیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ شیخ سلیم کا رنگ زرد تھا۔ عارف عبدالمتین بار بار ہونٹوں پر خشک زبان پھیر رہا تھا۔ نصیر انور اسی طرح بے پروا تھا۔

پریس رپورٹر موجود تھے۔ کاغذ پنسل ہاتھ میں لیے وہ بڑی بے چینی سے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ چند لمحات مکمل سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد میاں اے۔ ایم سعید صاحب کھنکارے۔ دانتوں کی گرفت سے قلم آزاد کیا۔ عینک کو روشنائی دکھائی۔ فیصلے کے کاغذ الٹ پلٹ کیے اور بہت سوچ سوچ کر ایک کاغذ پر خالی جگہیں پر کیں۔ اس کے بعد میرے بارے میں اپنا فیصلہ صادر فرمایا ـــــ تین مہینے قید بامشقت اور تین سو روپے جرمانہ ـــــ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اکیس یوم مزید قید بامشقت ـــــ شیخ سلیم کا رنگ اور زیادہ زرد ہو گیا۔ اُس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے تسلی دی گویا یہ کہہ رہا ہے "کچھ فکر نہ کرو۔ میں وہاں جیل میں ضرور پہنچوں گا۔"

میں یہ سوچنے لگا تھا کہ مجسٹریٹ ضمانت قبول کرے گا یا نہیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد میاں اے۔ ایم سعید نے دوسری خالی جگہیں پر کیں اور بقایا دو ملزمین کے بارے میں فیصلہ سنایا ـــــ تین تین سو روپیہ جرمانہ ـــــ عدم ادائیگی

جرمانہ کی صورت میں اکیس یوم قید با مشقت

میں نے جرمانہ داخل کر دیا۔ شیخ خورشید صاحب نے میری ضمانت کے کاغذ پیش کیے تو میاں اے۔ ایم سعید نے کہا "میں اگر ضمانت منظور کرتا ہوں تو سزا کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے۔

شیخ خورشید صاحب نے یہ استدلال پیش کیا "آپ کا ارشاد درست ملزم نے جرمانہ ادا کر دیا ہے۔ جو اپیل منظور ہونے کی صورت میں یقیناً واپس مل جائے گا۔ لیکن وہ دو تین دن جو ضمانت ہونے سے پہلے میرا موکل جیل میں کاٹے گا۔ اپیل منظور ہونے پر کیا اُسے واپس مل جائیں گے۔"

استدلال بہت معقول تھا مگر پھر بھی میاں اے۔ ایم سعید کچھ دیر اڑے رہے آخر میں کرم فرمائی کی اور میری ضمانت قبول کر لی۔

عارف عبدالمتین کے والد صاحب نے اُن کا جُرمانہ ادا کر دیا۔ اب رہ گئے نصیر انور ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے بڑی بے پروائی سے کہا "میرے پاس تو فی الحال کچھ بھی نہیں ہے۔" مجسٹریٹ صاحب نے حکم دیا کہ ہتکڑی لگاؤ اور جیل بھیج دو۔ نصیر انور اُسی طرح خاموش کھڑا رہا۔ میرے دو سو روپے موجود تھے۔ چودھری نذیر مالک نیا ادارہ سے میں نے کہا کہ ایک سو روپے کا بندوبست کر دیں۔ مگر ان سے نہ ہو سکا۔ سپاہی ہتھکڑیاں لیے نصیر کی پیٹھ پیچھے کھڑا تھا۔ ان کی جھنکار عدالت کے کمرے میں گونج رہی تھی۔ باہر پولیس وین تھی۔ یعنی سارے لوازمات موجود تھے۔

آخر خورشید صاحب ہی کام آئے۔ آپ نے میاں اے۔ ایم سعید صاحب سے بڑے مناسب و موزوں الفاظ میں درخواست کی کہ وہ نصیر انور کی ضمانت لے لیں۔ جرمانے کا روپیہ وہ کل صبح داخل کر دیں گے۔ مجسٹریٹ صاحب نے

یہ درخواست قبول کرلی۔ اب ضامن کا سوال تھا۔ شیخ خورشید صاحب نے پوچھا: "ان کی ضمانت کون دے گا؟"

کوئی آگے نہ بڑھا۔ اچانک شیخ سلیم نے جو اب تک نشے میں دھت ہوچکے تھے شیخ خورشید صاحب سے مخمور لہجے میں کہا: "نصیر صاحب کی ضمانت میں دیتا ہوں"۔۔۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ اگر عدالت کو معلوم ہوگیا کہ شیخ صاحب پئے ہوئے ہیں تو ان کی ضمانت کون دے گا۔۔۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور دھر لئے جائیں گے اور سارا معاملہ چوپٹ ہوجائے گا۔۔۔ میں اسی خوف کے مارے کمرے سے باہر چلا گیا۔ بار بار اندر جھانک کر دیکھتا کہ شیخ سلیم گرفتار ہوئے ہیں یا کہ نہیں۔ لیکن خیریت گذری۔ نصیر انور کی ضمانت ہوگئی۔۔۔ شیخ صاحب جھومتے ہوئے باہر نکلے اور مجھے گلے لگا کر رونے لگے: "اللہ میاں نے میرے بھائی کو بچالیا"۔ یہ کہہ کر آپ نے جیب سے بوتل نکال کر ایک گھونٹ بھرا جو کہ آخری تھا: "چلو بھئی چلیں۔ کہیں دوکان بند نہ ہوجائے"۔

نصیر انور بہت ممنون و متشکر تھا۔ بار بار شیخ سلیم کا شکریہ ادا کرتا تھا۔ شیخ صاحب نے اُس سے کہا: "شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ آپ میرے دوست کے دوست ہیں"۔

اب سیشن میں اپیل دائر کرنے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ میاں اے۔ ایم سعید کے فیصلے کی نقل حاصل کرنے کے لئے درخواست دی جب نہ ملی تو درخواست کے ساتھ "پہیئے" لگائے۔ نقل مل گئی۔

میاں صاحب کا فیصلہ انگریزی میں تھا۔ ذیل میں اُس کا انگریزی اردو ترجمہ درج ہے۔

فیصلہ

ایک اردو رسالہ بہ نام "جاوید" کے ایڈیٹر عارف عبدالمتین اور اس کے

پبلشر نصیر انور کو معہ ایک مصنف مسمی سعادت حسن منٹو کے میرے پاس مقدمہ زیر دفعہ ۲۹۲ پی۔ پی سی کے لیئے بھیجا گیا ہے۔ مؤخر الذکر ملزم کے خلاف یہ الزام ہے کہ وہ ایک فحش کہانی جس کا عنوان "ٹھنڈا گوشت" ہے کا مصنف ہے اور جو مذکورہ بالا رسالہ کے ایک خاص نمبر میں شائع ہوئی ہے۔ دوسرے دو ملزموں کے خلاف یہ الزام ہے کہ انھوں نے اس کہانی کو مندرجہ بالا انداز میں شائع کرنے کا جرم کیا ہے۔

رسالہ "جاوید" کا خاص نمبر مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ سید ضیاء الدین مترجم پریس برانچ حکومت پنجاب کے علم میں آیا۔ جو اس مقدمہ میں گواہ استغاثہ ۳ کی حیثیت سے پیش ہوا ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی بھی طبع شدہ چیز میں کوئی فحش مواد محسوس کرے تو اس سے حکومت پنجاب کو مطلع کرے۔ اس کے خیال میں مذکورہ بالا ایڈیشن میں شائع شدہ کہانی بعنوان "ٹھنڈا گوشت" فحش تھی۔ چنانچہ اس نے حکومت پنجاب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور اس غرض کے لیئے قانونی کارروائی کے لیئے کہا۔

اس کہانی کی تصنیف اور خاص نمبر میں اس کی اشاعت سے انکار نہیں کیا گیا۔ اور نہ پہلے دونوں ملزم رسالے کے مدیر اور ناشر ہونے سے منکر ہیں لہٰذا اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کہانی "ٹھنڈا گوشت" فحش ہے یا نہیں۔

استغاثہ نے مذکورہ رسالے کے خاص نمبر کو پیش کیا ہے جو ریکارڈ میں (EX-P-F) کی حیثیت سے درج کیا گیا ہے کہانی جو اس قانونی چارہ جوئی کا موضوع ہے، اس شمارے کے صفحہ ۸۸ سے ۹۳ تک چھپی ہے۔ میں نے نہایت غور سے اس کہانی کو پڑھا جو موضوع کی تشکیل کرتی ہے اور دیکھا کہ اس میں گندہ طرز بیان اور ناشائستہ گالیاں استعمال کی گئی ہیں۔ میں نے یہ بھی

محسوس کیا۔ اس کہانی میں کئی مناظر ایسے ہیں جو حد درجہ کی فحاشی لیئے ہوئے ہیں۔

یہ طے کرنے کے لیئے کہ آیا کوئی تصنیف مثلاً زیر بحث کہانی فحش ہے یا نہیں، ضروری ہے کہ ایک معیار مقرر کیا جائے جس سے فحاشی کی تمیز کی جاسکے۔ ۲ کیو۔ بی (۱۸۶۸ء) میں ہکلن رپورٹ میں اسی موضوع کے ایک مشہور مقدمے میں لارڈ کوک بورن جی۔ جے صفحہ ۳۶۰ (یا صفحہ ۱، ۲) پر فحاشی کا یہ معیار مقرر کیا تھا اس قسم کا الزام زدہ مواد جوان لوگوں کو بد اخلاقی اور بدچلنی کی ترغیب دے۔ جن کے اذہان اس قسم کے مخرب اخلاق اثرات قبول کر سکتے ہوں۔ اور جن کے ہاتھوں میں اس قسم کا مواد پہنچ سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تمام عدالت ہائے عالیہ ہمیشہ اس معیار کی تقلید کرتی رہی ہیں۔ اس معیار سے یہ ظاہر ہے کہ قانون میں مستعملہ عریانی اس ماحول سے متعلق ہے جس میں کہ یہ جانچی جاتی ہے۔ وہ باتیں جو ایک پاکستانی کے اخلاق کے لیئے ضرر رساں خیال کی جائیں۔ جہاں تک ایک فرانسیسی کا تعلق ہے، بالکل بے ضرر سمجھی جاسکتی ہیں۔ ہر سوسائٹی کے اپنے اخلاقی معیار ہوتے ہیں۔ اور وہ چیزیں جو ایک سوسائٹی کا اخلاقی قوام خیال کی جاتی ہیں۔ بعض اوقات اسی دوسری سوسائٹی کے معیار کے مطابق غیر اخلاقی ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح اظہار کے بعض اسالیب کا اثر مختلف سوسائٹیوں کے افراد پر مختلف ہوتا ہے خواہ یہ اظہار مخالف معیاروں کے نزدیک غیر اخلاقی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیئے زیر بحث کہانی کے فحش یا غیر فحش ہونے کا فیصلہ پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیاروں کے پس منظر پر کرنا ہوگا۔ اور اس امر کے مطابق جو اس قسم کی تحریر اس سوسائٹی میں رہنے والے لوگوں کے اذہان پر ڈالے گی۔

لارڈ کوک برن کا قائم کردہ معیار ایک مکمل [illegible] تعریف نہیں ہے
جیسا کہ اس کا مفہوم ظاہر کرتا ہے صرف ایک معیار [illegible] کے علاوہ کچھ اور
بھی معیار ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک وہ رجحان [illegible] الزام زدہ مواد میں موجود
ہے جو قارئین کے اخلاقی احساسات کو ٹھیس پہنچاتا [illegible] یہ معیار بھی قارئین
کے ا[illegible]ق پر منحصر ہے۔

استغاثہ نے ابتدا میں صرف پانچ گواہ پیش کیے [illegible] کیس بند کر دیا۔
گواہ استغاثہ ۱۔ مسٹر محمد یعقوب منیجر کیور آر [illegible] ۲۔ شیخ
محمد طفیل ۳۔ مرزا محمد اسلم۔ گواہ استغاثہ [illegible] ان امور کے
متعلق شہادت دی جن کا فحاشی سے کوئی تعلق نہیں۔ گواہ استغاثہ ۵ سید
ضیاء الدین نے دوسرے امور بیان کرنے کے [illegible] منٹو کی زیر
بحث کہانی فحش ہے تاہم ریکارڈ میں کوئی ایسی [illegible] جس سے ظاہر ہو کہ
یہ گواہ ماہر ادب سمجھا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں [illegible] شہادت کی دفعہ ۴۵
کی رو سے اس کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہے۔ جہاں تک فحاشی کے
مسئلے کا تعلق ہے۔ استغاثے کا کیس جیسا کہ ابتداً پیش کیا گیا، خود عدالت کی رائے
اور الزام زدہ مواد کے مطالعہ کے بعد اس کی ماہیت پر منحصر ہوگا۔

ملزمین نے صفائی میں سات گواہ ادبی امور کے ماہرین کی حیثیت سے پیش
کیے ان گواہوں کی شہادت سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ زیر بحث تحریر فحش نہیں
ہے۔ صفائی کے اختتام پر استغاثے نے درخواست کی کہ مسئلے کی اہمیت کے
پیشِ نظر کچھ اور ماہرین بطور عدالتی گواہ بلائے جائیں اور میں نے انصاف کی خاطر
چار اور ماہروں کو بطور عدالتی گواہ بلوایا۔

بیشتر ماہرین نے خواہ وہ صفائی کی طرف سے پیش ہوئے یا عدالت کی طرف سے

کسی نہ کسی فریق کے حق میں رائے دی کہ زیر بحث کہانی فحش ہے یا نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، تعزیرات میں جو فحاشی کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اس کی ٹیکنیکل اہمیت ہے جس کا تعین عدالت کو کرنا ہے۔ ماہرین کی شہادت اسی حد تک ضروری ہے جہاں تک یہ ادب کے مروجہ معیاروں، اظہار کی شستگی، سوقیانہ پن، اخلاقی یا غیر اخلاقی حیثیت اور اس رجحان کے متعلق جو کوئی تحریر قارئین کے اذہان پر اثر انداز ہو روشنی ڈالتی ہے۔ ان امور سے یہ تعین کرنا عدالت کا کام ہے کہ کوئی چیز فحاشی کی شرائط کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔

صفائی کے گواہ (۱) مسٹر عابد علی عابد۔ (۲) مسٹر احمد سعید (۳) ڈاکٹر عبدالحکیم (۴) ڈاکٹر سعید اللہ (۵) فیض احمد فیض (۶) صوفی غلام مصطفے تبسم (۷) ڈاکٹر آئی لطیف سب صاحب علم ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق کیونکہ آرٹ زندگی کا آئینہ دار ہے اس لیے فن کار کوئی ایسی چیز جو زندگی کی سچی تصویر ہو حقیقت پسندانہ طور پر پیش کرنے سے اپنے حقوق سے تجاوز نہیں کرتا۔ اس لیے وہ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ زندگی کا حقیقت پسندانہ اظہار فحش نہیں ہو سکتا۔ وہ زیر بحث کہانی کی غیر شائستہ زبان اور اس کے سوقیانہ محاوروں کو بھی قابلِ گرفت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ اُس قسم کی گفتگو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جو پیش کردہ کردار کے زمرے کے لوگ بولتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے یہ کہا ہے کہ زیر بحث کہانی میں قارئین کے اخلاق کو بگاڑنے کا کوئی میلان نہیں پایا جاتا۔ بعض نے اس نکتے پر خاموشی اختیار کی۔ عدالتی گواہ (۱) مولانا تاجور (۲) آغا شورش کاشمیری (۳) مولانا ابو سعید بزمی (۴) ڈاکٹر تاثیر بھی اُسی پائے کے علمی آدمی ہیں۔ ان گواہوں کی شہادت سے یہ بات نمایاں کی گئی ہے کہ زیر بحث کہانی، بڑا ادب ہے اور غیر شائستگی سے پیش کی گئی ہے۔

صفائی کے گواہ ۴ ڈاکٹر آئی لطیف نے رائے ظاہر کی کہ اگر زیر بحث کہانی کسی میڈیکل جریدے میں شائع ہوتی تو یہ ایک سبق آموز کیس ہسٹری ہوتی۔ لیکن ایک مقبول عام رسالے میں جسے ہر شخص پڑھ سکتا ہے، ناموزوں معلوم ہوتی ہے۔

صفائی کے گواہ ۵ کرنل فیض احمد فیض کا خیال ہے کہ اگرچہ وہ اسے فحش نہیں کہہ سکتے تاہم یہ کہانی ادب کا کوئی اچھا نمونہ نہیں۔ اس میں بعض غیر شائستہ محاورے استعمال کیئے گئے ہیں۔ جن سے اجتناب کیا جا سکتا تھا۔

عدالتی گواہ ۱ مولانا تاجور نے اس کی سخت اور غیر مبہم الفاظ میں مذمت کی۔ اور کہا کہ انھوں نے اپنے چالیس سالہ ادبی تجربے میں اس سے زیادہ کوئی چیز غیر شائستہ نہیں دیکھی۔ عدالتی گواہ ۲ ڈاکٹر تاثیر کی رائے ہے کہ اس میں ان لوگوں کا اخلاق بگاڑنے کا رجحان موجود ہے جو اخلاقی گراوٹ کا موجب بن سکتا ہے۔

پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے حوالے سے بہت صحیح طور پر معلوم ہو سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غیر شائستگی اور شیطنت کی لگام شیطان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ غیر شائستگی، نفس پرستی اور سفلیانہ پن زندگی میں موجود ہے اگر ادبی مذاق کے اس معیار کو تسلیم کر لیا جائے جسے صفائی کے گواہوں نے بیان کیا ہے تو زندگی کے پہلوؤں کا حقیقت نگارانہ اظہار اچھا ادب ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ہمارے معاشرے کے اخلاقی معیار کی خلاف ورزی کرے گا۔ ملزم سعادت حسن منٹو کی لکھی ہوئی کہانی ایک سوتیلا آدمی کے کردار کو پیش کرتی ہے۔ ساری کہانی ایک ناشائستہ معاملے پر مرکوز ہے۔ درحقیقت بدتہذیبی اس کہانی کا بنیادی تصور ہے۔

ادبی اور نفسیاتی ماہر کہانی کا ایک خاص انداز سے ردِ عمل قبول کر سکتے ہیں۔ تاہم میری رائے میں ایک الھڑ نابالغ پر اس قسم کی کہانی کا ردِ عمل اظہار بول چال اور خیالات میں غیر شائستگی کی حوصلہ افزائی کی صورت میں ہوگا۔

سعادت حسن منٹو جیسے بزعم خود مشہور مصنف کی مثال پیش نظر رکھتے ہوئے وہ نوجوان جو اس کہانی کو پڑھیں گے اسی طرح سے غیر شائستگی کو تقویت دیں گے۔

کہانی بعنوان "ٹھنڈا گوشت" کو غور سے پڑھنے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ اس میں قارئین کا اخلاق بگاڑنے کا میلان موجود ہے اور یہ ہمارے ملک کے مروجہ اخلاقی معیاروں کی خلاف ورزی کرتی ہے۔

اس لیئے میں ملزم سعادت حسن منٹو کو ایک فحش تحریر پیش کرنے کا ذمہ دار ٹھیراتا ہوں، اور اسے زیر دفعہ ۲۹۲ پی۔ پی۔ سی تین ماہ قید باشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا دیتا ہوں۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اس کو مزید ۲۱ یوم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

ملزمین عارف عبدالمتین اور نصیر انور جو واضح طور پر جریدے کے مدیر اور ناشر تھے، جس میں مذکورہ کہانی شائع ہوئی ہے، ایک فحش تصنیف کی اشاعت عام کے مجرم ہیں اور وہ بھی اسی دفعہ کے تحت آتے ہیں۔ تاہم ان کے معاملے میں ان کی کم عمری کے پیش نظر اور پھر یہ کہ کہانی کا مصنف ایک ایسا شخص تھا جو خاصی ادبی شہرت کا مالک ہے انہوں نے اس اعتماد کی وجہ سے کہانی قبول کر لی ہوگی کہ یہ قابل قبول ادب پارہ ہوگا۔ میں ان ہر دو ملزموں کے لیئے تین تین سو روپیہ جرمانے کی نرم سزا تجویز کرتا ہوں۔ چونکہ یہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کریگی اس لیئے میں اس کے مطابق حکم دیتا ہوں۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں ملزمین عارف عبدالمتین اور نصیر انور کو اکیس یوم قید بامشقت بھگتنی پڑیگی۔ دستخط

اے۔ ایم سعید مجسٹریٹ درجہ اول لاہور

۲۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو سیشن میں اپیل دائر کر دی گئی۔ تاریخ ملنے پر ہم مہرالحق صاحب سیشن جج لاہور کی عدالت میں پیش ہوئے۔ آپ نے اس بنا پر کہ وہ مجھے اور میرے خاندان کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم شہر (یعنی امرتسر) کے تھے مقدمہ مسٹر جوشوا اڈیشنل سیشن جج کی عدالت میں منتقل کر دیا۔ دوسری پیشی پر حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ مسٹر جوشوا نے کیس واپس مہرالحق صاحب کو بھیج دیا ہے۔ یہ عذر ظاہر کر کے کہ وہ اردو زبان اچھی طرح نہیں جانتے۔ مہرالحق صاحب نے سوچ بچار کے بعد مقدمہ عنایت اللہ خاں صاحب اڈیشنل سیشن جج کی عدالت کے سپرد کر دیا۔ ہم حاضر ہوئے تو عنایت اللہ خاں صاحب نے ہمارے وکیل سے فرمایا "یہ کیس چونکہ میرے لیئے اپنی نوعیت کا پہلا کیس ہے۔ اس لیئے میں اچھی طرح اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیئے وقت درکار ہے۔ میں آپ کو ایک مہینے بعد کی تاریخ دیتا ہوں۔

شیخ خورشید احمد نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ دلائل کے لیئے جولائی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ شیخ خورشید صاحب نے عدالت سے باہر آ کر مجھ سے کہا "اچھا ہے اس دوران میں میں بھی خوب تیاری کر لوں گا۔ لیکن انھوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ہمارا کیس غلط آدمی کے پاس گیا ہے جو بڑا تنگ خیال ہے۔ داڑھی رکھتا ہے نماز روزے کا پابند ہے۔ میں نے کہا "ہٹایئے۔ یہاں نہیں تو ہائی کورٹ میں دیکھا جائے گا"

شیخ خورشید صاحب نے اس دوران میں اپنی رہبری کے لیئے مجھ سے کہا کہ میں اپنے افسانے "ٹھنڈا گوشت" پر ایک مختصر سا تبصرہ لکھ دوں۔ چنانچہ میں نے اُنہیں ایک تبصرہ لکھ دیا۔

دس جولائی کا دن گزر چکا۔ آج ہی سے مجھے سخت تشویش لاحق تھی۔ گھر میں سب

دعائیں مانگ رہے تھے کہ خدا خیر کرے۔ جج صاحب نے خاص کیس سمجھتے ہوئے چار گھنٹے بحث کے لیئے وقف کر رکھے تھے مجھے ڈر تھا کہ میاں اے ایم سعید کی طرح کہیں عنایت اللہ خاں صاحب کا رویہ بھی مخاصمانہ نہ ہو۔ کیونکہ ضبط کرنا میرے لیئے بہت مشکل ہے۔ میاں سعید صاحب کی عدالت میں کئی دفعہ ایسے موقعے آئے تھے کہ میں چھلک پڑوں مگر حیرت ہے میں نے کیسے ضبط کیا۔

ہم سب صبح حاضر عدالت ہوئے تو عنایت اللہ خاں صاحب نے اپنے دھیمے لہجے میں شیخ خورشید صاحب سے کہا: "معاف کیجئے۔ آپ کو آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا۔ میں ذرا یہ چھوٹے چھوٹے معاملے طے کر لوں۔"

ہم عدالت سے باہر نکل آئے۔ عارف عبدالمتین خاموش تھا۔ شیخ خورشید صاحب بھی خاموش تھے۔ اپنے ساتھ وہ موٹی موٹی قانونی کتابوں کا ایک ڈھیر اٹھا کے لائے ہوئے تھے۔ ان کا دماغ شاید ان کے حوالوں میں گم تھا۔ میں ہائیکورٹ کی سوچ رہا تھا۔ نصیر انور حیدری گھاس پر رومال بچھا کر اس پر بیٹھا غالباً کوئی کشمیری گیت گنگنا رہا تھا۔

پونے گھنٹے کے بعد ہمیں بلایا گیا۔ ہم عدالت کے کمرے میں داخل ہوئے جج صاحب کو سلام کیا — عنایت اللہ خاں صاحب نے گردن کی ایک ہلکی سی جنبش سے اس کا جواب دیا۔ ہم ملزموں کے کٹہرے کی طرف بڑھنے لگے تو آپ نے اپنی دھیمی آواز میں کہا: "کرسیوں پر تشریف رکھیئے۔"

میں سمجھا کہ شاید یہ کسی اور سے کہا گیا ہو مگر ان کا روئے سخن ہماری طرف ہی تھا مجھے بڑا خوشگوار تعجب ہوا — ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نصیر انور کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ بیحد مطمئن نظر آتا تھا۔

پیشتر اس کے کہ بحث شروع ہوتی جج صاحب بولے: "میں نے اس کیس کا

بغور مطالعہ کیا ہے۔ آپ حضرات مطمئن رہیں۔ کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ میں نے مثل میں سے صرف عدالت ماتحت کا فیصلہ پڑھا ہے۔ گواہیوں کا میں نے مطالعہ کرنا غیر ضروری سمجھا ہے۔ البتہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" بہت غور سے پڑھا ہے"۔

بحث شروع ہونے والی تھی کہ عنایت اللہ خاں صاحب نے استغاثے اور صفائی کے وکیلوں کی توجہ چند نکات کی طرف دلائی اور وضاحت چاہی۔ شیخ خورشید احمد خاموش رہے۔ ایک دو مرتبہ جج صاحب کی تائید میں البتہ کچھ ضرور کہا۔ پروسی کیوٹر صاحب کی تردید خود خان صاحب کر رہے تھے۔ قریباً آدھا گھنٹہ قانونی موشگافیاں کرنے کے بعد آپ نے مسکرا کر کہا "میں سعادت حسن منٹو کو اگر سزا دوں تو وہ یہ کہیں گے کہ ایک داڑھی والے نے مجھے سزا دی"۔ ۔۔۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر اور عدالتِ ماتحت کے فیصلے پر کچھ کہتے رہے۔ آخر میں ہم سے مخاطب ہوئے "کیا آپ لوگوں نے جرمانہ ادا کر دیا تھا"۔ ہم سب نے کہا "جی ہاں"۔ اس پر جج صاحب نے کہا "آپ بری ہیں"۔ جرمانہ آپ کو پورے کا پورا واپس مل جائے گا۔

میں چند لمحات کچھ سوچ نہ سکا کہ کیا ہوا ہے۔ شیخ خورشید صاحب نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا "اٹھیئے حضرت۔ آپ بری ہیں"۔

عدالت سے باہر نکل کر جب میں نے چپڑاسیوں کو دس روپے انعام کے طور پر دیئے تو مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی بری ہوں اور یہ کہ چوتھی مرتبہ میرا انجام بخیر و خوبی ہوا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے ایک بہت بڑی لعنت سے مجھے رہائی دلائی۔ شیخ خورشید صاحب اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے اور بجا خوش تھے۔

عنایت اللہ خان صاحب کے انگریزی زبان میں لکھے ہوئے فیصلے کا اردو ترجمہ یہ ہے

اپیل بخلاف حکم مسٹر اے ایم سعید مجسٹریٹ درجہ اول لاہور

مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۵۰ء

دعوے زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی۔

سزا:۔ عارف عبدالمتین تین سو روپیہ جرمانہ بصورت عدم ادائیگی تین ہفتہ قید با مشقت سعادت حسن منٹو کو تین ماہ قید با مشقت اور تین سو روپے جرمانہ بصورت عدم ادائیگی اکیس یوم قید با مشقت۔ نصیر انور تین سو روپیہ جرمانہ۔ بصورت عدم ادائیگی تین ہفتے قید با مشقت۔

فیصلہ

یہ تین نوجوانوں عارف عبدالمتین، نصیر انور اور سعادت حسن منٹو کی طرف سے ایک اپیل ہے۔ اوّل الذکر دونوں ایک اردو رسالہ "جاوید" کے علی الترتیب مدیر اور ناشر ہیں۔ تیسرا ایک ادیب ہے جس نے مذکورہ رسالے کے مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع شدہ ایک خاص نمبر میں اپنی ایک کہانی جس کا نام "ٹھنڈا گوشت" ہے چھپنے کے لئے دی۔

انہیں بحکم میاں اے۔ ایم۔ سعید مجسٹریٹ درجہ اوّل لاہور مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۵۰ء زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی۔ (فحش کتابوں کی فروخت وغیرہ) کی خلاف ورزی کے سلسلے میں مجرم قرار دیا گیا ہے۔ مصنف مسٹر منٹو کو تین ماہ قید با مشقت اور تین سو روپیہ جرمانہ بصورت عدم ادائیگی جرمانہ ۲۱ یوم مزید قید با مشقت کی سزا دی گئی ہے۔ دوسرے دو یعنی مدیر اور ناشر کو صرف تین تین سو روپیہ جرمانہ بصورت عدم ادائیگی تین تین ہفتہ قید با مشقت کی سزا دی گئی ہے۔

یہ تفصیلوں اپیل میں پیش ہوئے ہیں۔
واقعات فیصلہ زیر اپیل میں موجود ہیں۔
مضمون کی طرف حکومت کی توجہ پریس برانچ کے ایک عہدیدار نے مبذول کرائی تھی اور چیف سکریٹری نے قانونی چارہ جوئی کا حکم دیا تھا۔ میں نے فریقین کے فاضل مشیرانِ قانون کو سنا ہے اور مثل کا مطالعہ کیا ہے میرا خیال ہے کہ ملزم کے خلاف جرم ثابت نہیں کیا جا سکا اور سزا برقرار نہیں رہ سکتی میرا خیال ہے کہ مضمون زیر بحث کو فحش اور خاص طور پر خلافِ قانون قرار نہیں دیا جا سکتا۔
ملزمین رسالہ سے اپنا تعلق مانتے ہیں۔ اب طے کرنے کے لیے فقط ایک سوال ہے کہ کہانی فحش اور خصوصاً خلافِ قانون ہے یا کہ نہیں۔ اس سلسلے میں کئی نکتے پیدا ہوتے ہیں: (۱) اوّل یہ کہ "فحش" لفظ سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔ دوم یہ کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں ماہرین کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے۔ سوم یہ کہ آیا مضمون زیر بحث قابلِ اطلاق معیاروں کے مطابق فحش قرار دیا جا سکتا ہے؟ میں نے قانونِ جرائم ایڈیشن ۱۹۲۵ء میں رتن لال وغیرہ کی کومنٹری دیکھی ہے اور وہاں اٹھائے ہوئے سوالوں پر فریقین کے پیش کردہ دلائل پر غور کیا ہے۔
فحاشی کی جانچ کا معیار وہاں یہ مقرر کیا گیا ہے۔ آیا فحاشی کے تحت الزام زدہ مضمون میں اُن لوگوں کے اخلاق بگاڑنے اور ان کو بُری ترغیب دینے کا میلان ہے۔ جن کے ذہن ایسے غیر اخلاقی اثرات قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ؟ اور جن کے ہاتھوں میں اس قسم کی تصنیف عوام کے اخلاق کے لیے ضرر رساں ہے اور اندازہ کیا جائے کہ وہ جن کے ہاتھ میں پہنچے گی ۔۔ ان

کے ذہن میں بدچلنی اور بدکاری کا اثر پیدا کرے گی تو یہ ایک فحش اشاعت ہوگی قانون کا منشا ہے کہ اس کو روکے۔ اگر کوئی تحریر حقیقتاً کسی ایک ہی جنس کے نوجوانوں یا زیادہ عمر کے لوگوں کے اذہان کو انتہائی گندے قسم کے خیالات سجھائے تو اس کی اشاعت خلافِ قانون ہے خواہ ملزم کے پیشِ نظر کوئی درپردہ مقصد ہی کیوں نہ ہو جو معصوم حتیٰ کہ قابلِ تعریف ہو۔ کوئی چیز جو جذبات کو مشتعل کرے فحش ہے"۔

پھر ایسے فیصلے بھی ہیں جو قرار دیتے ہیں کہ محض فقروں اور جملوں کو اس لیے معاف نہیں کیا جاتا کہ باقی کی اشاعت نا قابلِ اعتراض ہے اور کہ یہ کوئی جواز نہیں کہ شائع شدہ مضمون کسی ممتاز مصنف کا لکھا ہوا ہے یا ایسے اسلوب میں لکھا گیا ہے جو آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آ سکتا یا یہ کہ اشاعت میڈیکل ہے اور صرف مخصوص گاہکوں کے پاس بھیجی جاتی ہے ہمیں نہ صرف تصنیف کی ماہیت کو بلکہ حاضر معاشرہ کی حالت کو بھی دیکھنا ہے۔ اگر تصنیف بازار میں آزادانہ مہیا ہو سکتی ہے تو ہمیں یہ طے نہیں کرنا کہ مخصوص یا خواہش سے خریدنے والے گاہک اور پڑھنے والے کون ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ عوام تک پہنچ سکتی ہے ؟ جن میں دونوں جنس کے جوان سال اور بڑی عمر کے لوگ بھی شامل ہیں۔

پس ہمیں تصنیف کی ماہیت کا اپنے سماج کی موجودہ حالت کی روشنی میں تعین کرنا ہے۔ میرے خیال میں اس معاملے کو.... ... اس مقام پر چھوڑا جا سکتا ہے اور ہمیں اس کی طرف بعد میں رجوع کرنا چاہیئے۔ جب ہم اس مسئلے پر غور کر چکیں کہ آیا یہ سوال ماہروں کی رائے سے طے ہو سکتا ہے یا نہیں۔ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ معاملہ ماہروں کی رائے

سے ہرگز طے پلنے والا نہیں ہیں اس پر غور نہیں کرتا کہ اس کے متعلق کچھ خاص اور ممتاز ادیب کیا رائے قایم کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمیں یہ پڑتا لنا ہے کہ پڑھنے والوں پر عام طور سے تحریر و تصنیف کا کیا ردّعمل ہوگا۔

اگر میرا یہ خیال درست ہے تو فاضل عدالت ماتحت کی ریکارڈ کردہ شہادتوں کا کوئی حصہ اس نکتے کے لحاظ سے قابلِ قبول نہیں رہ سکتا۔ اگر بفرضِ محال ہم ان حضرات جو فریقین یا عدالت کی طرف سے پیش ہوئے، ان کی شہادت کو عام پڑھنے والوں کی شہادت کی حیثیت سے قبول کریں۔ اور کسی ایک فریق کو خاص اہمیت نہ دیں تو ریکارڈ شدہ شہادت عدالت کو کوئی زیادہ مدد نہیں دیتی۔ گواہوں کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ زیر بحث مضمون انتہائی فحش ہے۔ دوسری جماعت نے اس کے خلاف بیان دیا ہے اور اسے ایک افسانوی پارہ قرار دیا ہے جس میں کوئی بھی غیر اخلاقی چیز نہیں۔

غور کرنے پر یہ پتہ چل سکتا ہے کہ یہ رائے عین قدرتی فرق ہے۔ مختلف طبقوں کے پڑھنے والوں کا ردِعمل مختلف ہوتا ہے۔ جب تک ہم جانچ کا ایک معیار مقرر نہ کریں جس کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اتفاق رائے پیدا نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مختلف مزاجوں، عمروں، پیشوں اور مختلف قسم کی تعلیم حاصل کیئے ہوئے لوگوں کا ردِّعمل بھی ضرور مختلف ہوگا۔ اور علاوہ اس کے یہ طے ہے کہ اخلاق ایک اضافی اصطلاح ہے۔ فحاشی کے سوال پر نظریات ضرور ایک دوسرے سے مختلف اور نمایاں حد تک مختلف ہونگے۔

میری رائے میں صحیح بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو اس "افسانوی آدمی" ۔ "پبلک کے ایک عام رکن" کے نقطۂ نظر سے جانچنا چاہیئے۔

یہ طے کر چکنے کے بعد ہمیں یہ دیکھنے کے لیئے زیر بحث مضمون پر غور کرنا

ہے کہ یہ ہمارے سماج کے مسلّمہ اخلاقی نظریات کے خلاف کہاں تک جاتا ہے۔

اس موقعہ پر مجھے زیر اپیل فیصلے کے ایک غلط مفروضے اور گمراہ کرنے والی دلیل کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ فاضل مجسٹریٹ نے اس بیان سے ابتدا کی کہ "فحاشی" کی اصطلاح اس ماحول کے ساتھ متعلق ہے جس میں اس کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے اس نے کہا کہ مختلف قوموں اور سوسائٹیوں کے معیار مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک وہ درست تھا۔ اس نے غلطی وہاں کی جب اس نے یہ سمجھا کہ پاکستان کے مروّجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے سوا اور کہیں سے زیادہ صحیح طریقے پر معلوم نہیں ہو سکتے۔ پھر وہ یہ کہتا ہے کہ اس کے مطابق "غیر شائستگی شیطان کی طرف سے ہے"۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ہمارا آدرش ہے لیکن سوال یہ نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ ہمارے سماج کی اصل حالت کیا ہے جیسا کہ ظاہر ہے ہم نے اپنا نصب العین ابھی تک حاصل نہیں کیا۔ اپیل کرنے والوں کو اس کے مطابق جانچنا چاہیئے۔ جس طرح کہ ہماری سوسائٹی ہے نہ کہ اس طرح جیسا کہ اسے ہونا چاہیئے۔

جب ہم سوچتے ہیں کہ کیسی کیسی مطبوعات مارکیٹ میں موجود ہیں جن پر کوئی احتساب قائم نہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زیر بحث مضمون کہیں کم قابلِ اعتراض ہے۔ متعدد "اسراری" مطبوعات کی اشاعت کے خلاف کوئی پابندی نہیں جن سے زیادہ اور کوئی چیز فحش نہیں ہو سکتی۔ سینماؤں میں "تماشاؤں" کی نمائش پر کوئی احتساب نہیں جو زیر بحث مضمون سے کچھ کم قابلِ اعتراض نہیں ہوتے۔ اگر ہمیں مغربی تہذیب کو اپنانا اور اس کو پسند کرنا ہے جیسا کہ ہم کر رہے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایسی تحریر پر جیسی کہ ہمارے سامنے موجود ہے بمعقول طور پر فحاشی کا اعتراض نہیں کر سکتے۔ یہ تو اس تہذیب کا لازمی نتیجہ ہے اور حسب معمول اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

فحش مناظر ایک ایسی چیز ہیں جو ہر روز سیناؤں میں پیش کیئے جاتے ہیں۔ بدکاری

وہ عام اور بنیادی زمین ہے جس پر "سچی کہانیاں" اور دائمی مثلثیں استوار کی جاتی ہیں۔ درحقیقت یہی تمام انگریزی اور مغربی ناولوں کا بنیادی پلاٹ ہے۔ اگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تو مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم کیوں ان نوجوانوں پر سختی کریں۔

زیر بحث کہانی رسالے کے صفحہ ۸۸ سے لے کر ۹۳ تک چھپی ہے۔ قصہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک خاص شخص کا جس کا نام ایشر سنگھ تھا، ایک خاص عورت کلونت کور کے ساتھ ناجائز تعلق تھا۔ اس نے فسادات کے دوران میں ایک مکان میں چھ آدمیوں کو قتل کر دیا تھا اور ایک خوبصورت لڑکی کو وہاں سے اٹھا لایا تھا۔ لیکن اسے پتہ چلا کہ لڑکی مر چکی ہے "ٹھنڈا گوشت" ہے۔ اس کہانی کے مطابق اس انکشاف نے ایشر سنگھ پر ایسا اثر کیا اور اس کے جذبات کو اتنا بدل دیا تھا کہ کلونت کور کے پاس وہ جس مقصد کی تکمیل کیلئے آیا تھا وہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

اس میں یہاں وہاں کچھ ناشائستہ اصطلاحیں اور کچھ قابلِ اعتراض الفاظ موجود ہیں اور کچھ سوقیانہ گالیاں بھی — بالکل اسی قسم کی جو ہماری سوسائٹی کے نچلے طبقے میں عام ہیں۔

اب کسی مضمون کی ماہیت پر غور کرنے کے لیے آدمی کو کئی اصطلاحات اور تصریحات کو زیرِ نظر رکھنا پڑے گا۔ مثلاً چند ایک کا نام لیں تو ایک مضمون "باذوق" یا "بدذوق"، "غیر مناسب" یا "سوقیانہ"، "ناشائستہ" یا "فحش" ہو سکتا ہے۔ ان تدریجی رنگوں کے امتزاج کو ایک دوسرے سے الگ ہٹا کر اس مضمون کو جسے فحش قرار دیا جاتا ہو قطعی طور پر "غیر شائستہ"، "غیر اخلاقی"، "ضرر رساں" اور "بہت کچھ اور" ہونا چاہیئے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ جو میں اس مضمون کے متعلق کہوں گا وہ یہ ہے کہ یہ سوقیانہ اور ناشائستہ ہے۔

فاضل پی پی ایس نے کسی ایسے خاص قابلِ اعتراض پیروں کی طرف اشارہ نہیں کیا جس کو وہ یقینی طور پر "فحش" قرار دیتا۔

کسی شخص نے کہانی کی چند سطروں پر نشان لگائے ہیں لیکن وہ ایسی ہی ہیں جن کے متعلق میں پیشتر ذکر کر چکا ہوں اور ان کو دوبارہ پیش کرنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

مجھے اس لئے فاضل عدالت ماتحت سے اختلاف ہے لیکن میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد یہ ہے کہ مجھے اس مضمون سے اتفاق ہے۔ میں اسے "فحش" یا زیادہ قابلِ اعتراض نہیں سمجھتا۔

چنانچہ میں اپیل منظور کرتا ہوں اور تینوں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔ وہ پہلے ہی ضمانت پر ہیں۔ جرمانہ اگر ادا کیا گیا ہے تو وہ سارے کا سارا واپس دیا جائے۔

ایک لطیفہ سنیئے۔ گیارہ جولائی کی صبح کو نذیر احمد چودھری مالک "نیا ادارہ" اور مدیر "سویرا" جو دوسرے ترقی پسندوں کے ساتھ مل کر مجھے رجعت پسند قرار دے چکے ہیں اور حلف اٹھا چکے ہیں کہ میری کوئی تحریر اپنے "سویرا" میں شائع نہیں کریں گے۔ تشریف لائے۔ بغل گیر ہو کر بڑی گرمجوشی سے مبارک باد دی اور کہا "منٹو صاحب! آپ "ٹھنڈا گوشت" عنایت فرما دیجئے۔ میں "نمرود کی خدائی" میں شامل کر لوں۔"

میں چودھری صاحب کی اس درخواست پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

چند دن ہوئے کوہاٹ سے ایک صاحب انفینٹری کیڈٹ مظہر علی خاں کا خط

موصول ہوا۔

مجھے امید ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں کون ہوں۔ ریاض صاحب کی دکان پر آپ سے چند ملاقاتوں ہی نے مجھے آپ کا گرویدہ بنا دیا بہت دن ہوئے میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ کو "ٹھنڈا گوشت" سے نجات مل گئی ہے۔ فرصت کم ہونے کے باعث آپ کو مبارکباد کا خط نہ لکھ سکا۔ اب گو مبارکباد بہت دیر سے ہے لیکن پھر بھی آپ قبول فرمائیں۔ مجھے پکا یقین ہے کہ ایسی مخالفتوں کے باوجود آپ کے مداح بڑھتے ہی جائیں گے۔

سنا ہے چودھری محمد حسین صاحب جو آپ کے ساتھ اکثر نوک جھوک کرتے رہتے تھے اس دنیا ہی سے چل بسے۔ اب تو معاملہ کچھ بے مزہ سا ہو گیا لیکن دنیا میں سرپھروں کی کمی نہیں۔ کوئی اور صاحب ان کی جگہ ضرور سنبھال لیں گے۔"

مجھے چودھری محمد حسین صاحب کی وفات کا بہت افسوس ہے۔ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے۔ اب کہ وہ اس دنیا میں نہیں میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ ان کی جگہ اگر کوئی دوسرا سنبھالے گا تو میں کہوں گا ــــ

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

سعادت حسن منٹو

لاہور ۲۹ راگست ۱۹۵۰ء

ٹھنڈا گوشت

ایشر سنگھ جونہی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا، کلونت کور پلنگ پر سے اُٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اُس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، شہر کا مضافات ایک عجیب پُراسرار خاموشی میں غرق تھا۔

کلونت کور پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشر سنگھ جو غالباً اپنے پراگندہ خیالات کے اُلجھے ہوئے دھاگے کھول رہا تھا، ہاتھ میں کرپان لیے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ کلونت کور کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا، اور دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ ایشر سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت، تیز آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سرمئی غبار، ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔

ایشر سنگھ سر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اُس کی کس کر باندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کرپان تھامے ہوئے تھے تھوڑے تھوڑے لرزاں تھے، مگر اس کے قد و قامت اور خدوخال

سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک مضبوط نوجوان ہے۔

چند لمحات جب اسی طرح خاموشی میں گذر گئے تو کلونت کور تیز تیز آنکھوں کو نچا کر صرف اس قدر کہہ سکی "ایشر سیاں"۔

ایشر سنگھ نے گردن اٹھا کر کلونت کور کی طرف دیکھا، مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

کلونت کور چلائی "ایشر سیاں" لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پلنگ پر سے اٹھ کر اس کی جانب جاتے ہوئے بولی "کہاں رہے تم اتنے دن؟"

ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "مجھے معلوم نہیں"

کلونت کور بھنا گئی "یہ بھی کوئی جواب ہے؟"

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا جو اب ایشر سنگھ سے لبالب بھرا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا "کیا ہوا ہے تمہیں؟"

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ "کلونت!"

آواز میں درد تھا۔ کلونت کور کی آنکھوں میں پیار چھلک آیا "ہاں جی"

ایشر سنگھ نے پگڑی اتار دی۔ کلونت کور کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا اس کی گوشت بھری پیٹھ پر زور سے دھپا مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے آپ سے کہا "دماغ ہی خراب ہے"

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گئے۔ کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی

کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا "ایشر سیاں کہاں رہے تم اتنے دن ؟"

"قبر میں !" ایشر سنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور دفعتاً دونوں ہاتھوں سے اس کے بازو کو پکڑا۔ "قسم واہگورو کی بڑی خراب عورت ہو۔"

کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیئے اور پوچھا "تمہیں میری قسم بتاؤ، کہاں رہے ؟ — شہر گئے تھے ؟"

ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا "نہیں۔"

کلونت کور چڑ گئی "نہیں تم ضرور شہر گئے تھے — اور تم نے بہت سا روپیہ لوٹا ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

"وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے۔"

کلونت کور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی، لیکن فوراً ہی بھڑک اٹھی۔ "لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں ہوا کیا ؟ ... اچھے بھلے ... تھے۔ مجھے تم نے وہ تمام گہنے پہنا رکھے تھے جو تم شہر سے لوٹ کے لائے تھے ... پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا، اٹھے اور کپڑے پہن کر باہر نکل گئے۔"

ایشر سنگھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا "دیکھا کیسے رنگ پیلا پڑ گیا — ایشر سیاں، قسم واہگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے ؟"

"تیری جان کی قسم کچھ بھی نہیں۔"

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "ایشر

بان کیا بات ہے اب تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے ۔ ؟"
ایشر سنگھ ایکدم اُٹھ بیٹھا جیسے کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔ کلونت کور کو اپنے
پاس چارپائی پر بٹھا کر کہا: "کلونت میں دبی ہوں"
لیکن وہ شکایت کرتی رہی: "تم اُس رات باہر کیوں چلے گئے تھے:
"جہنم میں ۔"
"بتاؤ گے نہیں ۔"
"کوئی بات ہو تو بتاؤں:"
"مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو:"
ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دئیے ہونٹ اس
کے کانوں کے قریب لے جا کر سرگوشی کی۔ مونچھوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں
میں گھسے تو اُسے چھینک آ گئی ۔ دونوں ہنسنے لگے ۔
ایشر سنگھ نے کلونت کور کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ اب چھوڑ دو
پچھلی باتوں کو ۔
کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں ۔
ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا: "چل
دفان ہو:"
ایشر سنگھ نے اُس کے بھرے ہوئے بازو پر زور سے چٹکی بھری ۔ کلونت
کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی: "ہٹ جا ایشر سیاں، درد ہوتا ہے:"
ایشر سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کور کو دوبارہ پکڑ کر پاس بٹھا لیا اور
محبت بھری باتوں سے اس کا دل موم کرنے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل
گئی ——

کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا۔ ایشر سنگھ پر وحشت چھا گئی اور زور سے اس کے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے اُس نے کہا "کلونت قسم واہگورو کی بڑی اچھی ہو۔"

کلونت کور اپنے بازو پر اُبھرتے ہوئے لال دھبّے کو دیکھنے لگی "بڑا ظالم ہے تو ایشر سیاں؟"

ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا "تم بھی کسی سے کم نہیں کلونت۔"

کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح اُبلنے لگی۔ لیکن ایشر سنگھ نہ جانے کن خیالات میں کھو کر کلونت کے وجود کو بھی بھول گیا۔

کلونت کی ڈری ہوئی آواز اُبھری۔ "ایشر سیاں، تم کہاں ہو۔"

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی ہو وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کور نے اسے راغب کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر ناکام رہی۔ تو وہ جھلّا کر پلنگ سے نیچے اُتر گئی اور غصّے سے تھتھلا کر بپھرے ہوئے انداز میں کہا "ایشر سیاں وہ کون حرامزادی ہے جس کے پاس تو اتنے دن رہ کر آیا ہے اور جس نے تجھے مجھ سے چھین لیا ہے۔"

ایشر سنگھ نے پلنگ پر لیٹے لیٹے ... اُبھری۔

کلونت کور غصّے سے اُبلنے لگی "میں پوچھتی ہوں کون ہے وہ۔ کون ہے وہ۔ کون ہے وہ۔"

ایشر سنگھ نے ... زرد لہجے میں جواب دیا "کوئی بھی نہیں ... کوئی بھی نہیں"

کلونت کور نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ پوچھا "ایشر

ستیاں، میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی ــــ کھا واہگورو جی کی قسم ــــ کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں ؟"

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا، مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی "قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں بھی سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں ــــ تکا بوٹی کر دوں گی اگر تو نے جھوٹ بولا ــــ لے اب کھا واہگورو کی قسم .کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں ہے ؟

ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ کلونت کور بالکل دیوانی ہو گئی، لپک کر کونے میں سے کرپان اٹھائی، میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔

آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔ کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیئے، ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجا کی "جانے دے اب کلونت : جانے دے ۔

آواز میں بلا کا درد تھا۔ کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون ایشر سنگھ کے گلے سے اڑ اڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا، اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا۔

"کلونت ! تم نے بہت جلدی کی۔ لیکن جو ہوا ٹھیک ہوا" کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا۔

" مگر وہ کون ہے تمہاری لگتی ؟"

لہو' ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ گئی۔

"اور میں ...... اور میں ...... چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں ... اسی کرپان سے ......"

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی "میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرامزادی ؟"

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا "گالی نہ دے اُس معصوم کو"

کلونت چلّائی "میں پوچھتی ہوں وہ کون ہے ؟"

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رُندھ گئی "بتاتا ہوں"

یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اُس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا "انسان بھی ایک عجیب جانور ہے" کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"ایشر میاں، تو مطلب کی بات کر"

ایشر سنگھ کی مسکراہٹ اس کی لہو بھری مونچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی ۔

"مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں ... گلا چرا ہے میرا ...... اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا"

اور جب وہ بات بتانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لیپ ہونے لگے۔

"کلونت! میری جان ... میں تمہیں نہیں بتا سکتا میرے ساتھ کیا ہوا؟ ... انسان بھی ایک عجیب چیز ہے ... شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا ... گہنے پاتے اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے وہ میں نے تمہیں دیئے ... لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی"

ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور بڑی بے رحمی سے پوچھا "کون سی بات؟"

ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے ہوئے کہا: "جس مکان پر ... میں نے دھاوا بولا تھا ... اس میں ... اس میں سات آدمی تھے ... چھ میں نے قتل کر دیئے ... اسی کرپان سے جس سے تو نے مجھے ... چھوڑ اسے ... سن ... ایک لڑکی تھی بہت ہی سندر ... اس کو اٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا"

کلونت کور خاموش سنتی رہی۔ ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں پر سے لہو اڑایا "کلونت، میں تم سے کیا کہوں کتنی سندر تھی ... میں اسے بھی مار ڈالتا۔ لیکن آہ۔ میں اس کی معصومیت کا شکار ہو چکا تھا"

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا "ہوں ..."

اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا ... راستے میں کیا کہہ رہا تھا میں؟ ... ہاں راستے میں ... نہر کی پٹری پر تھوہڑ کی جھاڑیوں کے نیچے میں نے اسے کندھے سے اتارا" یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا "پھر کیا ہوا؟"
ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے! "... لیکن ... لیکن ..."
اس کی آواز ڈوب گئی۔
کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا "پھر کیا ہوا؟"
ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا جس کی بوٹی بوٹی غصّے کے باعث تھرک رہی تھی "وہ ... وہ مری ہوئی تھی ... لاش تھی ... بالکل ٹھنڈا گوشت ...
کلونت مجھے اپنا ہاتھ دے۔"
کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

بابو گوپی ناتھ!

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈیٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اس وقت لیڈر لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا۔ "منٹو صاحب بابو گوپی ناتھ سے ملیے۔"

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ "بابو گوپی ناتھ۔ تم ہندوستان کے نمبر ون رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے۔ لوگوں کا۔ ایسی ایسی کنٹی نیوٹلی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلہ لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب۔ مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ۔ ہے نہ اینٹی کی پینٹی پو؟"

عبدالرحیم سینڈو کے باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیوٹلی۔ دھڑن تختہ اور اینٹی کی پینٹی پو۔ ایسے الفاظ اس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا۔ جو بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ "آپ ہیں

بابو گوپی ناتھ۔ بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں۔ ساتھ میں کوہ کاف کی پری ہے۔

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا "نمبر ون بے وقوف ہوسکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں صرف باتیں کر کے ان سے ہر روز پولسن مٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں۔ بس منٹو صاحب۔ یہ سمجھ لیجئے کہ بڑے انٹی فلو جسٹین قسم کے آدمی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لائیے"

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا چونک کر کہا "ہاں ہاں ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب" پھر سینڈو سے پوچھا "کیوں سینڈو کیا آپ کچھ اس کا شغل کرتے ہیں۔"

عبدالرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا "اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں۔ تو منٹو صاحب آج شام کو ضرور آئیے گا۔ میں نے بھی پینی شروع کر دی ہے اس لئے کہ مفت ملتی ہے۔"

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتا لکھا دیا۔ جہاں میں حسب وعدہ شام چھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمرے کا صاف ستھرا فلیٹ تھا جس میں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے کے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں۔ تہمد پوش۔ پنجاب کا ٹھیٹ سائیں گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔ سینڈو نے اس کے بارے میں کہا "آپ بابو گوپی ناتھ

کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جایئے آپ۔ ہر آدمی جس کی ناک بہتی ہو۔ یا جس کے منہ میں سے لعاب نکلتا ہو۔ پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے۔ یہ بھی سب پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں۔ کیونکہ انہیں وہاں کوئی اور بے وقوف ملنے کی امید نہیں تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور سکاچ وسکی کے پیگ پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو۔"

غفار سائیں یہ سن کر مسکراتا رہا۔

دوسرے مرد کا نام تھا غلام علی۔ لمبا تڑنگا جوان، کسرتی بدن، منہ پر چیچک کے داغ۔ اس کے متعلق سینڈو نے کہا: "یہ میرا شاگرد ہے۔ اپنے استاد کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہو گئی۔ بڑی بڑی کنٹی نیوٹلیاں ملائی گئیں اس کو پھانسنے کے لیے مگر اس نے کہا ڈوا اور ڈائی۔ میں برہمچاری رہوں گا۔ ایک تکیے میں بات چیت، پیتے ہوئے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہو گئی۔ بس اس دن سے ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ ہر روز کریون اے کا ڈبہ اور کھانا پینا مقرر ہے۔"

یہ سن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا۔

گول چہرے والی ایک سرخ و سفید عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی کوہ کاف کی پری ہے جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا۔ کٹے ہوئے ہیں۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الھڑ اور نا تجربہ کار ہے۔ سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا: "زینت بیگم۔ بابو صاحب پیار سے زینو کہتے

ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ نامحرکشمیر سے سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اُڑے۔ مقدمے بازی ہوئی۔ آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے ــــ دھڑن تختہ۔

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں جن سے کافی بے حیائی ترشح تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ کیا اور سینڈو سے کہا۔ اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے۔"

سینڈو نے اس عورت کی پیٹھ پر ہاتھ مارا اور کہا۔" جناب یہ ہے ٹِن ٹِبوٹی۔ فل فل فوٹی۔ مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم ــــ آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا۔ دو برسوں ہی میں میرا دھڑن تختہ کرکے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوالیا ہے۔ تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن میں ملتا ہے۔ ہر روز شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے۔ مگر ویسے بڑی ٹِٹ فورٹیٹ قسم کی عورت ہے۔"

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا۔" بکواس نہ کر۔" اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔

سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسبِ عادت میری تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیئے۔ میں نے کہا۔" چھوڑ و یار۔ آؤ کچھ باتیں کریں۔"

سینڈو چلایا۔" بوائے۔ وسکی اینڈ سوڈا ــــ بابو گوپی ناتھ لگاؤ ہوا ایک سبزے کو۔"

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلندا نکالا

اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لیکر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا: "اڈگوڈ — او میرے رب العالمین — وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر یوں نوٹ نکالا کروں گا — جاؤ بھئی غلام علی۔ دو بوتلیں جانی واکر سُل گوئنگ سٹرانگ کی لے آؤ۔"

بوتلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسبِ معمول عبدالرحیم نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے وہ چلّایا: "دھڑن تختہ منٹو صاحب وسکی ہو تو ایسی۔ حلق سے اتر کر پیٹ میں انقلاب زندہ باد لکھتی چلی گئی ہے — جیو بابو گوپی ناتھ جیو۔"

بابو گوپی ناتھ بے چارہ خاموش رہا کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی رائے کوئی نہیں ہے۔ دوسرا جو بھی کہے مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دورانِ گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ میں نے چنانچہ اس سے ایک بار کہا: "بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

وہ چونک پڑا: "جی میں — میں — کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی۔ "ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں — اور ہمیں کیا سوچ ہوگی۔"

سینڈو نے کہا: "بڑے خانہ خراب ہیں یہ منٹو صاحب۔ بڑے خانہ خراب

ہیں — لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی گنتی ٹوٹلی نہ رہ چکی ہو۔"

بابو گوپی ناتھ نے یہ سن کر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا: "اب مجھ میں وہ دم نہیں منٹو صاحب۔"

اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی؟ کون منی تھی؟ کون کس کی نوچی تھی؟ نتھنی اتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار، سینڈو، غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی۔ ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا۔ مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اُسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وسکی کا ایک گلاس بھی پیا بغیر کسی دلچسپی کے۔ سگرٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا۔ اُسے تمباکو اور اس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں لیکن لطف یہ تھا کہ سب سے زیادہ سگرٹ اسی نے پئے۔ بابو گوپی ناتھ سے اُسے محبت تھی؟ اس کا پتا مجھے کسی بات سے نہ ملا۔ البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا کیونکہ زینت کی آسائش کے لیے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اُسے مورفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اٹھا کر قالین پر دراز ہو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لیے بھیج دیا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ

بکواس جب کچھ عرصے کے لیے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جو اب نشے میں تھا۔ زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا۔" منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔"

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔" بڑا نیک خیال ہے۔"

بابو گوپی ناتھ خوش ہو گیا۔" منٹو صاحب ہے بھی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا۔ جانِ من مکان بنوا دوں؟ جواب کیا دیا۔ معلوم ہے آپ کو؟ ــــ کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا کون ہے ــــ منٹو صاحب موٹر کتنے میں آ جائے گی؟"

میں نے کہا۔" مجھے معلوم نہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا۔" کیا بات کرتے ہیں آپ منٹو صاحب ــــ آپ کو اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلیے میرے ساتھ زینو کے لیے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئی میں موٹر ہونی ہی چاہیئے۔"

زینت کا چہرہ ردِ عمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ ہمہ تن جذبات ہو کر اُس نے مجھ سے کہا۔" منٹو صاحب آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں ــــ لیکن آپ مجھے بتائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا۔ مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو تو معاف کر دیجیے ــــ بہت گنہگار آدمی ہوں ــــ وسکی منگاؤں آپ کے لیے اور۔

میں نے کہا: "نہیں نہیں — بہت پی چکے ہیں"۔

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا۔" اور بیچئے منٹو صاحب یہ کہہ کر جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلندا نکالا اور ایک نوٹ جدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اُس کے ہاتھ سے لیئے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔" سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟"

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہو گئی بابو گوپی ناتھ سے کتنے آدمی اُس غریب کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا۔ بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا: "منٹو صاحب اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام علی کی جیب سے گر پڑے گا یا۔۔۔"

بابو گوپی ناتھ نے پورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی بدمعاش نے اس کی جیب میں سے سارے روپے نکال لیئے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکالا اور غلام علی کو دے کر کہا: "جلدی کھانا لے آؤ"۔

پانچ چھ ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔ پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا۔ لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔

پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چغد ہے غلط ثابت ہوا۔ اُس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوئے تھے مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں گالیاں سب سنتا تھا لیکن غصے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

: مٹو صاحب میں نے آج تک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔ جب بھی کوئی مجھے لڑاتے رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ لیکن میں انہیں عقلمند سمجھتا ہوں اس لیئے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شناخت کر لیا جس سے ان کا الو سیدھا ہو سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکیئے میں جا بیٹھوں گا۔ طوائف کا کوٹھا اور پیر کا مزار۔ بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ طوائف کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لیئے کہ جیب خالی ہونے والی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں۔ کسی ایک کے مزار میں چلا جاؤں گا۔

میں نے اس سے پوچھا "طوائف کے کوٹھے اور تکیئے آپ کو کیوں پسند ہیں؟"

کچھ دیر سوچ کر اس نے جواب دیا "اس لیئے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اس کے لیئے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔"

میں نے ایک اور سوال کیا "آپ کو طوائفوں کا گانا سننے کا شوق ہے کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کن سُری سے کن سُری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں ——— مٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب میں سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا یا وہ اسے لینے کے لیئے ایک ادا سے اٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جراب میں اڑس لیا۔ اس

نے جھک کر اُسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ طوائف کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے۔"

بابو گوپی ناتھ کا شجرۂ نسب تو میں نہیں جانتا لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بڑے کنجوس بنیئے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اُسے دس لاکھ روپے کی جائداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اڑانا شروع کر دی۔ بمبئی آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سوا سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔

زینو کے لیئے اس نے فیئٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی لفنگے ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی، لیکن اسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے۔ کچھ اپنی جدّت طراز گائکی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک حصّہ بہت کم پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ تین لڑکیاں

جو سگی بہنیں تھیں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار رسال کے وقفے کے بعد داشتہ بنایا ۔ یہ بھی بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مرگئی تھی اس لیے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے غمزے اور عشوے نہیں تھے ۔ لیکن یہ تو خیر ہر آدمی جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا ۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہنا ۔ عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا ۔ نفیس سے نفیس موٹر رکھی ۔ مگر اس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی ۔

عورتوں کے لیے خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں ۔ اس کی بذلہ سنج طبیعت میں جس میں میراثیوں کے مزاج کی جھلک تھی بہت ہی جاذب نظر تھی ۔ وہ کوشش کیے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا ۔

میں نے جب اسے ہنس ہنس کر زینت سے باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لیے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے ۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتہً یہاں پہنچا کیسے ۔ ایک سینڈو اسے جانتا تھا ۔ مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی ۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اُسے لایا تھا ۔ ان دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی ۔

بابو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حقہ پی رہا تھا ۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا ۔ وہ سگریٹ بالکل نہیں پیتا تھا ۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سنا رہا تھا جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی ۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا "اوبسم اللہ بسم اللہ ۔ کیا آپ کا گذر بھی اس وادی میں ہوتا ہے؟"

سینڈو نے کہا "تشریف لے آیئے عزرائیل صاحب یہاں دھڑن تختہ"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے خلیفے اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو۔ سادہ لوح۔ صاف ستھری۔

شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اوّل تو اس میں بھونڈا پن تھا، اس کے علاوہ ۔۔۔ کچھ یوں کہئے کہ اس بات کا بھی اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سینڈو اٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا جس سے فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آ گئے اور روتی روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے چلا گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ کہا۔ لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور "آئیے منٹو صاحب" کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

زینت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونو ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ دونو پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

[illegible] نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا "زینت [illegible] منٹو صاحب [illegible] تجھے اس

عورت سے بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے۔ میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں۔ میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹ کر کھاتی رہیں۔ مگر اس نے کبھی ایک زائد پیسہ مجھ سے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گرو رکھ کر گزارہ کیا۔ میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا اس کی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو۔ جو کچھ وہ کرتی ہیں سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں کل مجھے بھکاری ہونا ہی ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت مند کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسو گی۔ تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا بمبئی لے جاؤ اسے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبئی میں اس کی دو جاننے والی طوائفیں ایکٹریس بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبئی ٹھیک ہے۔ دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلایا ہے کہ اس کو سب گر سکھائے۔ غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری بے عزتی ہوگی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اس کو۔ بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رئیس ہیں۔ میں نے تمہیں موٹر لے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش کر لو ـــ منٹو صاحب میں خدا کی قسم کھاکر کہتا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بنک

میں دس ہزار روپیہ جمع کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہوئی سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لیگی۔ ـــ آپ بھی اسے سمجھائیے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے۔ سردار اسے ہر روز شام کو اپولو بندر لے جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سیٹھ وآج بڑی مشکل سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کے متعلق "۔

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا لیکن بابو گوپی ناتھ نے خود ہی کہا "اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت بھی ہے ـــ کیوں زینو ـــ پسند ہے تمہیں ؟"

زینو خاموش رہی۔

بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبئی لانے کی غرض وغایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دُور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بمبئی میں کسی اچھے مال دار آدمی سے شادی کرلے۔ یا فلم ایکٹریس بن جائے۔ تاکہ آرام سے زندگی گذار سکے۔ اور اس گندے ماحول کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے چھوڑ دے۔

زینت سے اگر صرف چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا۔ چونکہ اس کی نیت نیک تھی اس لیئے اس نے زینت کے مستقبل کے لیئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کو ایکٹریس بنانے کے لیئے۔ اس نے کئی جعلی ڈائرکٹروں کی دعوتیں کیں۔ گھر میں ٹیلیفون لگوا دیا لیکن اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی

عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا "شفیق صاحب تو خالی خولی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسّہ دیکھئے۔ لیکن بیچاری زینت سے چار چادریں، چھ تکیے کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سنا ہے آج کل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔"

یہ درست تھا۔ الماس نذیر جان پٹیالے والے کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لیے تھے۔ مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑ جھگڑ کر الماس نے زہر کھا لیا تھا۔

محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلیفون کیا اور کہا اُسے ڈھونڈھ کر میرے پاس لائیے۔ میں نے اُسے تلاش کیا۔ لیکن کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا "مجھے یہ پیغام اور ذریعوں سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے — ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

شفیق سے جب مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ پھر اپولو بندر جانا شروع کیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکلوں سے کئی گیلن پٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا کہ حالات امید افزا ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک نے جو ریشمی کپڑوں کی مل کا مالک تھا۔ زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گذر گیا۔ لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جانے کس کام سے ہارنبا روڈ پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر محمد یٰسین بیٹھا تھا، نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ موٹر تم نے کہاں سے لی ؟"

یٰسین مسکرایا "تم جانتے ہو موٹر والی کو"

میں نے کہا "جانتا ہوں"

"تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی ـــــ اچھی لڑکی ہے یار" یٰسین نے کہا میں مسکرا دیا۔

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے یٰسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام اپولو بندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں۔ وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑا کر چلا گیا۔ لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا اور اب یہ سوچ رہا تھا کہ کچھ دن اور گزر جائیں۔ زینت اور یٰسین کی شادی ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے ـــــ مگر ایسا نہ ہوا۔

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کرہ کرائے پر لیا۔ اس کی جوان لڑکی میوریل سے یٰسین کی واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ زینت بے چاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور یٰسین اس کی موٹر میں صبح شام اس لڑکی کو گھماتا رہتا۔ بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر بہت دکھ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب یہ کیسے لوگ ہیں۔ بھئی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔ لیکن زینت بھی عجیب ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی۔ میاں اگر تم نے اس کرشان چھوکری سے دوستی کرنا ہے تو اپنی موٹر کا بندوبست کرو۔ میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو ـــــ میں کیا کروں منٹو

صاحب - بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے ـــــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ـــــ تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیئے "

لیبین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔

بہت دنوں تک کوئی نئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ ایک دن ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ، غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے۔ روپے کا بندوبست کرنے - کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو چکے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اُسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔

سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی اور سینڈو کو پولسن مکھن کی چنانچہ دونوں نے متحدہ کوشش کی کہ زینت کو دوبارہ گندے ماحول میں لے جائیں۔

میں نے ایک دن زینت سے کہا " یہ تم کیا کر رہی ہو - ؟"

اس نے بڑے الھڑ پن سے کہا " مجھے کچھ معلوم نہیں ہے بھائی جان - یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں "

جی چاہا تھا کہ دیر تک پاس بیٹھ کر سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو ٹھیک نہیں سینڈو اور سردار اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے تمہیں بیچ بھی ڈالیں گے مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اکتا دینے والی حد تک بے سمجھ۔ بے امنگ اور بے جان عورت تھی۔ اس کم بخت کو اپنی زندگی کی کچھ قدر و قیمت ہی معلوم نہیں تھی - واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر۔ سگریٹ سے شراب سے، کھانے سے، گھر سے ٹیلیفون سے، حتیٰ کہ اُس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ ناہم گیا تو وہاں فلیٹ میں

کوئی اور ہی تھا۔ سینڈرو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اُسے پورا پتہ بتادیا۔ اُس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈرو اور سردار اس کو گڑھے ہی گرا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ اب کی دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور ہی چھوڑ آیا تھا ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا کہ میں ابھی اس کے ساتھ چلوں۔

تقریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈرو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا "سینڈرو"۔

سینڈرو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صرف اس قدر نکلا۔ "دھڑن تختہ"۔

بابو گوپی ناتھ نے اُس سے کہا آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو۔ لیکن سینڈرو نے کہا ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجئے۔ مجھے آپ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔"

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈرو اسے کچھ دور لے گیا۔ دیر تک اُن میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب ختم ہوئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا۔ "واپس لے چلو"۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ہم دادر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا۔ "منٹو صاحب

زینو کی شادی ہونے والی ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا۔" کس سے ؟"

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا۔"حیدر آباد سندھ کا ایک دولتمند زمیندار ہے خدا کرے دونوں خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہے جو میں عین وقت پر آ پہنچا۔ جو روپے میرے پاس ہیں ان سے زینو کا جہیز بن جائے گا ـــــ کیوں کیا خیال ہے آپ کا ـــ"

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیدرآباد سندھ کا دولتمند زمیندار کون ہے ؟ سینڈو اور سردار کی کوئی جعل سازی تو نہیں۔ لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ حقیقتہً حیدر آباد کا متمول زمیندار ہے جو حیدر آباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز یہ اپنے مربی غلام حسین (یہ اس حیدر آباد سندھ کے رئیس کا نام تھا) کو ساتھ لیکر آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارات کی۔ غلام حسین کی پُر زور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل سه نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے ـــــ گا کر سنائی۔ غلام حسین سو جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ پکا کر دیا اور شادی طے ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خوشی دوگنی ہو گئی۔ مجھ سے اس نے کہا۔" منٹو صاحب خوبصورت۔ جوان اور بڑا لائق آدمی ہے ـــــ میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخش کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی ـــــ بھگوان کرے دونوں خوش رہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیے اور پانچ ہزار نقد دیے۔

محمد شفیق طوسی۔ محمد یٰسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل۔ سینڈو میوزک ٹیچر میں اور گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے۔ دولہن کی طرف سے سینڈو وکیل تھا۔

ایجاب و قبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا: "دھڑن تختہ!"
غلام حسین سرج کا نیلا سوٹ پہنے تھا۔ سب نے اس کو مبارک باد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے مقابلے میں چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خورد و نوش کا جو سامان بھی ہوتا ہے بابو گوپی ناتھ نے مہیا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہوتے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لیے آیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے سے انداز میں کہا: "منٹو صاحب ذرا اندر جائیے اور دیکھیے زینو دلہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔"

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سرخ زربفت کا شلوار کرتہ پہنے تھی۔۔۔ دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا۔ حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی بہت بری معلوم ہوتی ہے مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے۔ اس نے شرما کر مجھے آداب کیا تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہا: "یہ کیا مسخرہ پن ہے۔"
زینت نے میری طرف بالکل معصومیت سے دیکھا: "آپ مذاق کرتے ہیں

بھائی جان "

اُس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اُس نے اپنے رومال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا "منٹو صاحب میں سمجھا تھا آپ بڑے سمجھدار اور لائق آدمی ہیں ــــ زینو کا مذاق اُڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا"

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اُسے مجھ سے تھی زخمی نظر آئی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں اُس نے زینت کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا "خدا تمہیں خوش رکھے"

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی ــــ بہت ہی دُکھ بھری ملامت ــــ اور چلا گیا۔

جمیل کو اپنا شیفر لائف ٹائم قلم مرمت کے لیے دینا تھا۔ اس نے ٹیلی فون ڈائرکٹری میں شیفر کمپنی کا نمبر تلاش کیا۔ فون کرنے سے معلوم ہوا کہ اُن کے ایجنٹ میسرز ڈی، جے، سیمور ہیں جن کا دفتر گرین ہوٹل کے پاس واقع ہے۔

جمیل نے ٹیکسی لی اور فورٹ کی طرف چل دیا۔ گرین ہوٹل پہونچ کر اسے میسرز ڈی، جے سیمور کا دفتر تلاش کرنے میں دقت نہ ہوئی۔ بالکل پاس تھا۔ مگر تیسری منزل پر۔

لفٹ کے ذریعے سے جمیل وہاں پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی چوبی دیوار کی چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے اسے ایک خوش شکل اینگلو انڈین لڑکی نظر آئی۔

جمیل نے قلم اس کھڑکی کے اندر داخل کر دیا اور منہ سے کچھ نہ بولا۔ لڑکی نے قلم اس کے ہاتھ سے لیا، کھول کر ایک نظر دیکھا اور ایک چٹ پر کچھ لکھ کر جمیل کے حوالے کر دی۔ منہ سے وہ بھی کچھ نہ بولی۔

جمیل نے چٹ دیکھی۔ قلم کی رسید تھی۔ چلنے ہی والا تھا کہ پلٹ کر اُس نے لڑکی سے پوچھا: "دس بارہ روز تک تیار ہو جائے گا، میرا خیال ہے۔"

لڑکی بڑے زور سے ہنسی۔ جمیل کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔ "میں آپ کی ہنسی کا مطلب نہیں سمجھا۔"

لڑکی نے کھڑکی کے ساتھ منہ لگا کر کہا "مسٹر ـــــ آج کل والا ہے اور ـــــ یہ قلم امریکہ جائے گا ـــــ تم نو مہینے کے بعد پتا کرنا۔"

جمیل بوکھلا گیا۔ "نو مہینے بعد"

لڑکی نے اپنے بریدہ بالوں والا سر ہلایا۔ جمیل نے لفٹ کا رُخ کیا۔

یہ نو مہینے کا سلسلہ خوب تھا ـــــ نو مہینے ـــــ اتنی مدّت کے بعد تو ایک بچہ پیدا ہو جاتا ہے ـــــ نو مہینے ـــــ نو مہینے تک اس چھوٹی سی چیٹ کو سنبھالے رکھو ـــــ اور یہ بھی کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ نو مہینے تک آدمی یاد رکھ سکتا ہے کہ اُس نے ایک قلم مرمّت کے لیئے دیا تھا ـــــ ہو سکتا ہے اس دوران میں وہ کم بخت مر کھپ ہی جائے۔

جمیل نے سوچا، یہ سب ڈھکوسلا ہے ـــــ قلم میں معمولی سی خرابی تھی کہ اس کا فیڈر ضرورت سے زیادہ روشنائی سپلائی کرتا تھا۔ اس کے لیئے اسے امریکہ کے ہسپتال میں بھیجنا صریحاً چالبازی تھی ـــــ مگر پھر اس نے سوچا۔ لعنت بھیجو جی اس قلم پر ـــــ امریکہ جائے یا افریقہ۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے یہ بلیک مارکیٹ سے ایک سو پچھتر روپے میں خریدا تھا ـــــ مگر اس نے ایک برس اسے خوب استعمال بھی تو کیا تھا ـــــ ہزاروں صفحے کالے کر ڈالے تھے۔ چنانچہ وہ قنوطی سے ایک دم رجائی بن گیا۔ اور رجائی بنتے ہی اسے خیال آیا کہ وہ فورٹ میں ہے اور فورٹ میں شراب کی بیشمار دکانیں ہیں۔ وسکی تو خیر نہیں ملے گی، لیکن فرانس کی بہترین کونک برانڈی تو مل جائے گی، چنانچہ اس نے قریب ترین شراب کی دکان کا رُخ کیا۔

رانڈی کی ایک بوتل خرید کردہ لوٹ رہا تھا کہ گرین ہوٹل کے پاس آکے رُک گیا۔ ہوٹل کے نیچے قدم آنہ ہشیشوں کا بنا ہوا قالینوں کا شور رم تھا۔ یہ جمیل کے دوست پیر صاحب کا تھا۔

اُس نے سوچا چلو اندر چلیں۔ چنانچہ چند لمحات کے بعد ہی وہ شور رم میں تھا اور اپنے دوست پیر سے جو عمر میں اس سے کافی بڑا تھا ہنسی مذاق کی گفتگو کر رہا تھا۔

برانڈی کی بوتل ایک کاغذ میں لپٹی دبیز ایرانی قالین پہ لیٹی ہوئی تھی۔ پیر صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جمیل سے کہا: "یار اس دُلہن کا گھونگھٹ تو کھولو ــــ ذرا۔۔ اس سے چھیڑ خانی تو کروں"۔

جمیل مطلب سمجھ گیا۔ "تو پیر صاحب گلاس اور سوڈا منگوایئے ــــ پھر دیکھئے کیا رنگ جمتا ہے"۔

فوراً گلاس اور یخ بستہ سوڈے آگئے۔ پہلا دور رہا۔ دوسرا دور شروع ہونے ہی والا تھا کہ پیر صاحب کے ایک گجراتی دوست اندر چلے آئے اور بڑی بے تکلفی سے قالین پہ بیٹھ گئے۔ اتفاق سے ہوٹل کا چھوکرا دو کے بجائے تین گلاس اٹھا لایا تھا۔ پیر صاحب کے گجراتی دوست نے بڑی صاف اُردو میں چند اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ اور گلاس میں بہ بڑا پیگ ڈال کر اُس کو سوڈے سے لبا لب بھر دیا۔ تین چار لمبے لمبے گھونٹ لیکر انھوں نے رومال سے اپنا منہ صاف کیا: "سگریٹ نکالو یار"۔

پیر صاحب میں ساتوں عیب شرعی تھے۔ مگر وہ سگریٹ نہیں پیتے تھے جمیل نے جیب سے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور قالین پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی لائٹر۔ اس پر پیر صاحب نے جمیل سے اس گجراتی کا تعارف کرایا۔ مسٹر منوہر لال۔

—— آپ موتیوں کی دلالی کرتے ہیں۔"

جمیل نے ایک لمحے کے لیے سوچا کوئلوں کی دلالی میں تو انسان کا منہ کالا ہوتا ہے —— موتیوں کی دلالی میں ——"

پیر صاحب نے جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "مسٹر جمیل۔ مشہور سونگ رائٹر ہیں۔"

دونوں نے ہاتھ ملایا اور برانڈی کا نیا دور شروع ہوا اور ایسا شروع ہوا کہ بوتل خالی ہو گئی۔

جمیل نے دل میں سوچا کہ کمبخت موتیوں کا دلال بلا کا پینے والا ہے —— میری پیاس اور میرے سرور کی ساری برانڈی چڑھا گیا۔ خدا کرے اسے موتیا بند ہو۔

مگر جونہی آخری دور کے پیگ نے جمیل کے پیٹ میں اپنے قدم جمائے اُس نے نٹور لال کو معاف کر دیا اور آخر میں اس نے کہا: "مسٹر نٹور اٹھیے۔ —— ایک بوتل اور ہو جائے۔"

نٹور فوراً اٹھا۔ اپنے سفید ڈھیلے کی شکنیں درست کیں۔ دھوتی کی لانگ ٹھیک کی اور کہا: "چلیے۔"

جمیل، پیر صاحب سے مخاطب ہوا: "ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں۔"

جمیل اور نٹور نے باہر نکل کر ٹیکسی لی اور شراب کی دوکان پر پہنچے۔ جمیل نے ٹیکسی رو کی۔ مگر نٹور نے کہا: "مسٹر جمیل —— یہ دُکان ٹھیک نہیں ساری چیزیں مہنگی بیچتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو۔ کولابا چلو۔"

کولابا پہنچ کر نٹور جمیل کو شراب کی ایک چھوٹی سی دوکان میں لے گیا جو

برانڈ جمیل نے نورٹ سے لیا، وہ تو مل نہ سکا، ایک دوسرا مل گیا جس کی نٹور نے بہت تعریف کی کہ نمبر ون چیز ہے۔
سو یہ نمبر ون چیز خرید کر دونوں باہر نکلے ـــــ ساتھ ہی بار تھی۔ نٹور رُک گیا "مسٹر جمیل۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ ایک دو پیگ یہیں سے پی کر چلتے ہیں"
جمیل کو کوئی اعتراض نہیں تھا اس لئے کہ اس کا نشہ حالت نزع میں تھا چنانچہ دونوں بار کے اندر داخل ہوئے۔ معاً جمیل کو خیال آیا کہ بار والے تو کبھی باہر کی شراب پینے کی اجازت نہیں دیا کرتے "مسٹر نٹور، آپ یہاں کیسے پی سکتے ہیں۔ یہ لوگ اجازت نہیں دینگے"
نٹور نے زور سے آنکھ ماری "سب چلتا ہے"
اور یہ کہہ کر وہ ایک کیبن کے اندر گھس گیا۔ جمیل بھی اس کے پیچھے ہولیا ـــ نٹور نے بوتل سنگین تپائی پر رکھی اور بیرے کو آواز دی ـــــ جب وہ آیا تو اس کو بھی آنکھ ماری "دیکھو، دو سوڈے روجرز ـــــ ٹھنڈے ـــــ اور دو گلاس۔ ایک دم صاف"
بیرا یہ حکم سن کر چلا گیا اور فوراً سوڈے اور گلاس حاضر کر دیئے۔ اس پر نٹور نے اُسے دوسرا حکم دیا "فرسٹ کلاس چیپس اور ٹومیٹو سوس ـــ اور فرسٹ کلاس کٹلس"
بیرا چلا گیا۔ نٹور، جمیل کی طرف دیکھ کر ایسے ہی مسکرایا۔ بوتل کا کارک نکالا اور جمیل کے گلاس میں اس سے پوچھے بغیر ایک ڈبل ڈال دیا۔ خود اس سے کچھ زیادہ۔ سوڈا حل ہو گیا تو دونوں نے اپنے گلاس ٹکرائے۔
جمیل پیاسا تھا۔ ایک ہی جرعے میں اُس نے آدھا گلاس ختم کر دیا۔ سوڈا چونکہ بہت ٹھنڈا اور تیز تھا اس لئے جھوں جھوں کرنے لگا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد چیپس اور کٹلس آ گئے — جمیل صبح گھر سے ناشتہ کر کے نکلا تھا لیکن برانڈی نے اس سے بھوک لگا دی۔ چپس گرم گرم تھے کٹلس بھی۔ وہ پل پڑا — نثور نے اس کا ساتھ دیا چنانچہ دو منٹ میں دونوں پلیٹیں صاف تھا۔

دو پلیٹیں اور منگوائی گئیں۔ جمیل نے اپنے لیے چیپس بھی منگوائے۔ دو گھنٹے اسی طرح گذر گئے۔ بوتل کی تین چوتھائی ختم ہو چکی تھی۔ جمیل نے سوچا کہ اب پیر صاحب کے پاس جانا بے کار ہے۔

نشے خوب جم رہے تھے، سرور خوب گھٹ رہے تھے۔ نثور اور جمیل دونوں ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے۔ ایسے سواروں کو عام طور پر ایسی وادیوں میں جانے کی بڑی خواہش ہو جاتی ہے جہاں انھیں عریاں بدن حسین عورتیں ملیں۔ وہ ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے پر بٹھالیں اور یہ جا وہ جا۔

جمیل کا دل و دماغ اس وقت کسی ایسی ہی وادی کے متعلق سوچ رہا تھا جہاں اس کی کسی خوبصورت عورت سے مڈبھیڑ ہو جائے۔

جمیل کو اتنا تو معلوم تھا کہ وہ ایسی جگہ پر ہے — مطلب ہے ایسے علاقے میں ہے جو اپنے پردہ فعلز (قحبہ خانے) کی وجہ سے ساری بمبئی میں مشہور ہے۔ جنہیں عیاشی کرنا ہوتی ہے، وہ ادھر ہی کا رُخ کرتے ہیں۔ شہر سے بھی جس لڑکی کو تنک چھپ کر پیشہ کرنا ہوتا ہے یہیں آتی ہے۔ ان معلومات کی بنا پر اس نے نثور سے کہا۔

"میں نے کہا — وہ — وہ — میرا مطلب ہے ادھر کوئی چھوکری ووکری نہیں ملتی؟"

نثور نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ انڈیلا اور کہا "مسٹر جمیل —

۔ ایک نہیں ہزاروں ——— ہزاروں ——— ہزاروں ——"

یہ ہزاروں کی گردان جاری رہتی اگر جمیل نے اس کی بات کاٹی نہ ہوتی "یار ان ہزاروں میں سے آج ایک ہی مل جائے تو ہم سمجھیں کہ نٹور بھائی نے کمال کر دیا"

نٹور بھائی مزے میں تھے ——— جھوم کر کہا: "جمیل بھائی ——— ایک نہیں ہزاروں ——— چلو اس کو ختم کرو"

دونوں نے بوتل میں جو کچھ بچا تھا آدھے گھنٹے کے اندر اندر ختم کر دیا۔ بل ادا کرنے اور بیرے کو تگڑی ٹپ دینے کے بعد دونوں باہر نکلے ۔ اندر اندھیرا تھا۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی۔ جمیل کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ ایک لمحے کے لیئے اسے کچھ نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں تیز روشنی کی عادی ہوئیں تو اس نے نٹور سے کہا "چلو بھئی"

نٹور نے تلاشی لینے والی نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھا "مال پانی ہے نا ——؟"

جمیل کے ہونٹوں پر شیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ نٹور کی پسلیوں میں کہنی سے ٹہوکا دیکر اس نے کہا "بہت ـ نٹور بھائی بہت" اور اس نے جیب سے پانچ نوٹ سو سو کے نکالے "کیا اتنے کافی نہیں ۔؟"

نٹور کی باچھیں کھل گئیں "کافی ؟ ——— بہت زیادہ ہیں ——— چلو آؤ، پہلے ایک بوتل لے لیں ۔ وہاں ضرورت پڑے گی"

جمیل نے سوچا، بات بالکل ٹھیک ہے ۔ وہاں ضرورت نہیں پڑے گی تو کیا مسجد میں پڑے گی ۔ چنانچہ فوراً ایک بوتل خرید لی گئی ۔ ٹیکسی کھڑی تھی دونوں اس میں بیٹھ گئے اور اس وادی کی سیاحی کرنے لگے ۔

سیکڑوں بردہ فروش تھے۔ ان میں سے بیس پچیس کا جائزہ لیا گیا، مگر جمیل کو کوئی عورت پسند نہ آئی۔ سب میک اپ کی موٹی اور شوخ تہوں کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ جمیل چاہتا تھا کہ ایسی لڑکی ملے جو مرمت شدہ مکان معلوم نہ ہو جس کو دیکھ کر یہ احساس نہ ہو کہ جگہ جگہ اکھڑے ہوئے پلستر کے ٹکڑوں پر بڑے اناڑی پن سے سرخی چونا لگایا گیا ہے۔

نٹورتنگ آ گیا۔ اس کے سامنے جو بھی عورت آتی تھی، وہ جمیل کا کندھا پکڑ کر کہتا تھا۔

"جمیل بھائی چلے گی؟"

مگر جمیل بھائی انکار کرتا تھا۔ "ہاں چلے گی ——— اور ہم بھی چلیں گے!"

دو جگہیں اور دیکھی گئیں مگر جمیل کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ سوچتا تھا کہ ان عورتوں کے پاس کون آتا ہے۔ جو سور کے سوکھے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی ادائیں کتنی مکروہ ہیں۔ اٹھنے بیٹھنے کا انداز کتنا فحش ہے۔ اور کہنے کو یہ پرائیویٹ ہیں، یعنی ایسی عورتیں جو در پردہ پیشہ کراتی ہیں ——— جمیل کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ پردہ ہے کہاں جس کے پیچھے یہ دھندا کرتی ہیں۔

جمیل سوچ ہی رہا تھا کہ اب پروگرام کیا ہونا چاہیئے کہ نٹور نے ٹیکسی رکوائی اور اتر کر چلا گیا کہ ایک دم اسے ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا۔

اب جمیل اکیلا تھا ٹیکسی تیس میل فی گھنٹے کے حساب سے چل رہی تھی۔ ——— اس وقت ساڑھے چار بج چکے تھے ——— اس نے ڈرائیور سے پوچھا "یہاں کوئی ملے گا۔؟"

ڈرائیور نے جواب دیا "مل جائے گا جناب"

"تو چلو اس کے پاس"

ڈرائیور نے دو تین موڑ گھومے اور ایک پہاڑی بنگلہ نما بلڈنگ کے پاس گاڑی کھڑی کر دی۔ دو تین مرتبہ ہارن بجایا۔

جمیل کا سر نشے کے باعث سخت بوجھل ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھندسی چھائی ہوئی تھی ـــــ اسے معلوم نہیں کیسے اور کس طرح، مگر جب اس نے ذرا دماغ کو جھٹکا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک پلنگ پر بیٹھا ہے۔ اس کے پاس ہی ایک جوان لڑکی جس کی ناک کی پھننگ پر ایک چھوٹی سی پھنسی تھی۔ اپنے بریدہ بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔

جمیل نے اس کو غور سے دیکھا۔ سوچنے ہی والا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا۔ مگر اس کے شعور نے اس کو مشورہ دیا دیکھو یہ سب عبث ہے۔ جمیل نے سوچا، یہ ٹھیک ہے۔ لیکن پھر بھی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر نوٹ گن کر اور پاس پڑی ہوئی تپائی پر برانڈی کی سالم بوتل دیکھ کر اپنی تشفی کر لی کہ سب خیریت ہے۔ اس کا نشہ کسی قدر نیچے اتر گیا۔

اٹھ کر وہ گیسو بریدہ لڑکی کے پاس گیا۔ اور اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مسکرا کر اس سے کہا۔

"کہیے مزاج کیسا ہے"

اس لڑکی نے کنگھی میز پر رکھی اور کہا "کہیے آپ کا کیسا ہے"

"ٹھیک ہوں" یہ کہہ کر اس نے اس لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا "آپ کا نام ـــ؟"

"بتا تو چکی ایک دفعہ ـــــ آپ کو میرا خیال ہے یہ بھی یاد نہ رہا ہوگا

کہ آپ ٹیکسی میں یہاں آئے ——— جانے کہاں کہاں گھومتے رہے ہوں گے کہ بل ۸۰ روپے بنا، جو آپ نے ادا کیا اور ایک شخص جس کا نام شاید شوڈر تھا، آپ نے اس کو بے شمار گالیاں دیں۔"

جمیل اپنے اندر ڈوب کر سارے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے ہی والا تھا کہ اس نے سوچا کہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔ میں بھول جایا کرتا ہوں ——— یا یوں سمجھیے کہ مجھے بار بار پوچھنے میں مزہ آتا ہے ——— وہ صرف اتنا یاد کر سکا کہ اس نے ٹیکسی والے کا بل جو کہ اٹھتیس روپے بنتا تھا ادا کیا تھا۔

لڑکی پلنگ پر بیٹھ گئی: "میرا نام تارہ ہے۔"

جمیل اس سے مصنوعی قسم کا پیار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کو پیاس محسوس ہوئی تو اس نے تارہ سے کہا "دو یخ بستہ سوڈے اور گلاس۔"

تارہ نے یہ دونوں چیزیں فوراً حاضر کر دیں۔ جمیل نے بوتل کھولی، اپنے لیے ایک پیگ ڈال کر اس نے دوسرا تارہ کے لیے ڈالا ——— پھر دونوں پینے لگے۔

تین پیگ پینے کے بعد جمیل نے محسوس کیا کہ اس کی حالت بہتر ہو گئی ہے۔

جمیل نے تارہ کے عریاں جسم کو ایک نظر دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ اچھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خیالات کا تانتا بندھ گیا۔ جمیل کا نکاح ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔

اس کا بدن کیسا ہوگا ——— کیا وہ تارہ کی طرح اس کے ایک مرتبہ

ہکھنے پر اپنے ؟ ....

کیا وہ اُس کے ساتھ برانڈی پئے گی ؟

کیا اس کے بال کٹے ہوئے ہیں ؟

پھر فوراً اس کا ضمیر جاگا جس نے اس کو لعنت ملامت شروع کر دی نکاح کا یہ مطلب تھا کہ اس کی شادی ہو چکی تھی ۔ صرف ایک مرحلہ باقی تھا کہ وہ اپنی سسرال جائے اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لے آئے ـــــ کیا اس کے لیئے یہ واجب تھا کہ ایک بازاری عورت کو اپنے آغوش کی زینت بنائے ـــــ خُم کے خُم لنڈھا پھرے ۔

جمیلؔ بہت خفیف ہوا اور اسی خفّت میں اس کی آنکھیں مُندنا شروع ہوئیں اور وہ سو گیا ۔ تارہؔ بھی تھوڑی دیر کے بعد خواب غفلت کے مزے لینے لگی ۔

جمیلؔ نے کئی بے ربط اُرٹ پٹانگ خواب دیکھے ـــــ کوئی دو گھنٹے کے بعد جب کہ ایک بہت ہی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا ۔ وہ ہڑ بڑا کے اٹھا ۔ جب اچھی طرح آنکھیں کھلیں تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک اجنبی کمرے میں ہے اور اس کے ساتھ ایک لڑکی ہے ۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد واقعات آہستہ آہستہ اُس کے دماغ کی دُھند چیر کر نمودار ہونے لگے ۔

وہ خود بھی عریاں تھا ۔ بوکھلاہٹ میں اُس نے اُلٹا پائجامہ پہن لیا ۔ مگر اُس کو اِس کا احساس نہ ہوا ۔ کُرتہ پہن کر اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں ۔ نوٹ سب کے سب موجود تھے ۔ اُس نے سوڈا کھولا اور ایک پیگ بنا کر پیا ۔ پھر اس نے تارہؔ کو ہولے سے جھنجھوڑا ۔ "اٹھو ۔"

تارہؔ آنکھیں ملتی اُٹھی ۔ جمیل نے اُس سے کہا ۔ "کپڑے ...."

تارہ نے کپڑے پہن لیے ـــــ باہر گہری شام رات بننے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ جمیل نے سوچا، اب کوچ کرنا چاہیئے۔ لیکن وہ تارہ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا، کیونکہ بہت سی باتیں اُس کے ذہن سے نکل گئی تھیں "کیوں تارہ جب ہم لیٹے ـــــ میرا مطلب ہے جب میں نے تم سے لباس اُتارنے کو کہا تو اُس کے بعد کیا ہوا ؟"

تارہ نے جواب دیا "کچھ نہیں ـــــ آپ میرے بازو پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے سو گئے۔"

"بس ؟"

"ہاں ـــــ لیکن سونے سے پہلے آپ دو تین مرتبہ بڑبڑائے اور کہا، میں گناہ گار ہوں ـــــ میں گناہ گار ہوں۔" یہ کہہ کر تارہ اُٹھی اور اپنے بال سنوارنے لگی۔

جمیل بھی اُٹھا، گناہ کا احساس دبانے کے لیے اس نے ڈبل پیگ اپنے حلق میں جلدی جلدی انڈیلا۔ بوتل کو کاغذ میں لپیٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

تارہ نے پوچھا "چلے ؟"

"ہاں پھر کبھی آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ لوہے کی پیچ دار سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ بڑے بازار کی طرف اس کے گز در قدم اُٹھنے ہی والے تھے کہ ہارن بجا اُس نے مڑ کر دیکھا تو ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اُس نے کہا، چلو اچھا ہوا یہیں مل گئی۔ پیدل چلنے کی زحمت سے بچ گئے۔ اُس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"کیوں بھئی خالی ہے۔ ؟"

ڈرائیور نے جواب دیا۔" خالی ہے کا کیا مطلب —— لگی ہوئی ہے۔"

"تو پھر......." یہ کہہ کر جمیل مڑا، لیکن ڈرائیور نے اس کو پکارا "کدھر جاتا ہے سیٹھ۔"

جمیل نے جواب دیا۔" کوئی اور ٹیکسی دیکھتا ہوں۔"

ڈرائیور باہر نکل آیا۔" مسک تو نہیں پھر سے لا —— یہ ٹیکسی تمہیں نے تو لے رکھی ہے۔"

جمیل بوکھلا گیا۔" میں نے؟"

ڈرائیور نے بڑے گنوار لہجے میں اس سے کہا" ہاں تو نے —— سالا دارو پی کر سب کچھ بھول گیا۔"

اس پر توتو میں میں شروع ہوئی۔ اِدھر اُدھر سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ جمیل نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔" چلو۔"

ڈرائیور نے ٹیکسی چلائی۔" کدھر؟"

جمیل نے کہا" پولیس اسٹیشن!"

ڈرائیور نے اس پر جانے کیا واہی تباہی بکی —— جمیل سوچ میں پڑ گیا۔ جو ٹیکسی اس نے لی تھی، اس کا بل جو کہ اڑتیس روپے کا تھا اس نے ادا کر دیا تھا۔ اب یہ نئی ٹیکسی کہاں سے آن ٹپکی۔ گو وہ نشے کی حالت میں تھا۔ مگر وہ یقینی طور پر کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ ٹیکسی نہیں تھی اور نہ یہ ڈرائیور وہ ڈرائیور جو اسے یہاں لایا تھا اور تھا۔

پولیس اسٹیشن پہنچے۔ جمیل کے قدم بہت بری طرح لڑکھڑا رہے تھے سب انسپکٹر جو کہ اس وقت ڈیوٹی پر تھا فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔

اس نے جمیل کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور نے اپنی داستان شروع کر دی جو سرتا پا غلط تھی۔ جمیل یقیناً اس کی تردید کرتا اگر اس میں زیادہ بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ سب انسپکٹر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا "جناب میری سمجھ میں نہیں آتا' یہ کیا قصہ ہے۔ جو ٹیکسی میں نے لی تھی' اس کا کرایہ میں نے اڑتیس روپے ادا کر دیا تھا۔ اب معلوم نہیں یہ کون ہے اور مجھ سے کیسا کرایہ مانگتا ہے۔"

ڈرائیور نے کہا "حضور انسپکٹر بہادر۔ یہ دارو پئے لائے۔" اور ثبوت کے طور پر اس نے جمیل کی برانڈی کی بوتل میز پر رکھ دی۔

جمیل جھنجھلا گیا "ارے بھئی کون سور کہتا ہے کہ اس نے نہیں پی ——— سوال تو یہ ہے کہ آپ کہاں سے تشریف لے آئے۔"

سب انسپکٹر شریف آدمی تھا۔ کرایہ بوگس ڈرائیور کے حساب سے بیالیس روپے بنتا تھا۔ اس نے پندرہ روپے میں فیصلہ کر دیا۔ ڈرائیور بہت چیخا چلایا مگر سب انسپکٹر نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر تھانے سے نکلوا دیا۔ پھر اس نے ایک سپاہی سے کہا کہ وہ دوسری ٹیکسی بلائے۔ ٹیکسی آئی تو اس نے ایک سپاہی جمیل کے ساتھ کر دیا کہ وہ اسے گھر چھوڑ آئے۔ جمیل نے لکنت بھرے لہجے میں اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور پوچھا۔ "جناب کیا یہ گرانٹ روڈ پولیس اسٹیشن ہے۔"

سب انسپکٹر نے زور کا قہقہہ لگایا اور پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مسٹر اب ثابت ہو گیا کہ تم نے خوب پی رکھی ہے ——— یہ کولابہ پولیس اسٹیشن ہے ——— جاؤ اب گھر جا کے سو رہو۔"

جمیل گھر جا کر کھانا کھائے اور کپڑے اتارے بغیر سو گیا ——— برانڈی

کی توتل بھی اس کے ساتھ سوئی رہی۔

دوسرے روز وہ دس بجے کے قریب اُٹھا۔ جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ سر میں جیسے بڑے بڑے پتھر تھے، منہ کا ذائقہ خراب۔ اس نے اُٹھ کر دو تین گلاس فروٹ سالٹ کے پئے اور چار پانچ پیالے چائے کے۔ کہیں شام کو جاکر طبیعت کسی قدر بحال ہوئی اور اس نے خود کو گذشتہ واقعات کے متعلق سوچنے کے قابل محسوس کیا۔

بہت لمبی زنجیر تھی۔ ان میں سے بعض کڑیاں تو سلامت تھیں مگر بعض غائب۔ واقعات کا تسلسل شروع سے لیکر گرین ہوٹل اور وہاں سے کولابہ تک بالکل صاف تھا۔ اس کے بعد جب مٹور کے ساتھ خاص دادی کی سیاحی شروع ہوئی تھی معاملہ گڈمڈ ہو جاتا تھا۔ چند جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں بڑی واضح مگر فوراً مبہم پرچھائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

وہ کیسے اس لڑکی کے پاس پہنچا ـــــ اس کا نام جمیل کے حافظے سے پھسل کر جانے کس کھڈ میں جاکر گر پڑا تھا اس کی شکل وصورت اسے البتہ بڑی اچھی طرح یاد تھی۔

وہ اس کے گھر کیسے پہنچا تھا؟ ـــــ یہ جاننا بہت اہم تھا۔ اگر جمیل کا حافظہ اس کی مدد کرتا تو بہت سی چیزیں صاف ہو جاتیں۔ مگر بصد کوشش بھی وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

اور یہ پہیلیوں کا کیا سلسلہ تھا۔ اس نے پہلی کو تو چھوڑ دیا تھا، مگر دوسری کہاں سے ٹپک پڑی تھی۔؟

سوچ سوچ کے جمیل کا دماغ پاش پاش ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جتنے وزنی پتھر اس میں پڑے تھے سب آپس میں ٹکرا کر چور چور ہو گئے۔

رات کو اس نے برانڈی کے تین پگ پیے۔ تھوڑا سا ہلکا کھانا کھایا اور گذشتہ واقعات کے متعلق سوچتا سوچتا سو گیا۔

وہ ٹکڑے جو گم ہو گئے تھے ان کو تلاش کرنا اب جمیل کا شغل ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اس روز ہوا من وعن ہوا اس کی آنکھوں کے سامنے آ جائے اور یہ روز روز کی سر پاشی دور ہو ـــــ اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی بڑا قلق تھا کہ اس کا گناہ نامکمل رہ گیا۔ وہ سوچتا تھا یہ ادھورا گناہ جائیگا کس کھاتے میں۔ وہ چاہتا تھا کہ بس ایک دفعہ اس کی بھی تکمیل ہو جائے۔

مگر تلاش بسیار کے باوجود وہ پہاڑی بنگلوں جیسا مکان جمیل کی آنکھوں سے اوجھل رہا۔ جب وہ تھک ہار گیا تو اس نے ایک دن سوچا کیا یہ سب خواب ہی تو نہیں تھا۔

مگر خواب کیسے ہو سکتا تھا۔ خواب میں آدمی اتنے روپے تو خرچ نہیں کرتا ـــــ اس روز اس کے کم از کم ڈھائی سو روپے خرچ ہوئے تھے۔

پیر صاحب سے اس نے نثو رکے متعلق پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ اس روز کے بعد دوسرے دن ہی سمندر پار کہیں چلا گیا ہے۔ غالباً موتیوں کے سلسلے میں۔ جمیل نے اس پر ہزار لعنتیں بھیجیں اور اپنی تلاش شروع کر دی

اس نے جب اپنے حافظے پر بہت زور دیا تو اسے بنگلے کی دیوار کے ساتھ پیتل کی ایک پلیٹ نظر آئی ـــــ اس پر کچھ لکھا تھا ـــــ غالباً ـــــ ڈاکٹر ـــــ ڈاکٹر بہرام جی ـــــ آگے جلے گیا۔

ایک دن کولابہ کی گلیوں میں پیدل چلتے چلتے آخر وہ ایک ایسی گلی میں پہنچا جو اس کو جانی پہچانی معلوم ہوئی ـــــ دو رویہ اس قسم کی بنگلا نما عمارتیں تھیں۔ ہر عمارت کے باہر چھوٹے چھوٹے پیتل کے بورڈ لگے تھے کسی پر چار کسی پر پانچ

کسی پر تین۔

وہ اِدھر اُدھر غور سے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ مگر اس کے دماغ میں وہ خط گھوم رہا تھا جو صبح اس کی ساس کی طرف سے وصول ہوا تھا کہ اب انتظار کی حد ہوگئی ہے، میں نے تاریخ مقرر کر دی ہے، آؤ اور اپنی دولہن کو لے جاؤ۔

اور اِدھر وہ ایک نامکمل گناہ کو مکمل بنانے کی کوشش میں مارا مارا پھر رہا تھا جمیل نے کہا، ہٹاؤ جی اس وقت ــــــ پھر نے دو مارا مارا ــــــ

ایک دم اس نے اپنے دائیں ہاتھ پیتل کا ایک چھوٹا سا بورڈ دیکھا۔ اس پر لکھا تھا ــــــ ڈاکٹر ایم بیرام جی۔ ایم ڈی۔

جمیل کانپنے لگا۔ یہ وہی بلڈنگ ــــــ بالکل وہی ــــــ وہی رنگ وہی بل کھاتی ہوئی آہنی سیڑھیاں۔ جمیل بے دھڑک اوپر چڑھ گیا۔ اس کیلئے اب ہر چیز جانی پہچانی تھی۔ کوری ڈور سے نکل کر اس نے سامنے والے دروازے پر دستک دی۔

ایک لڑکے نے دروازہ کھولا ــــــ اسی لڑکے نے جو اس روز سوڈا اور برف لایا تھا۔ جمیل نے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے اس سے پوچھا "بیٹا، بائی جی ہیں؟"

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی ہاں"

"جاؤ ان سے کہو، صاحب ملنے آئے ہیں" جمیل کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

لڑکا دروازہ بھیڑ کر اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور تارہ نمودار ہوئی۔ اس کو دیکھتے ہی جمیل نے پہچان لیا کہ وہی لڑکی ہے، مگر اب اس کی ناک پر پھنسی نہیں تھی۔ "نمستے" نمستے ــــــ کہیے مزاج کیسے ہیں" یہ کہہ کر اس نے اپنے کٹے ہوئے بالوں

کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

جمیل نے جواب دیا" اچھے ہیں ۔۔۔ میں پچھلے دنوں بہت مصروف رہا، اس لیئے نہ آسکا ۔۔ کہو پھر کیا ارادہ ہے ؟"

تارہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا" معاف کیجیئے، میری شادی ہو چکی ہے۔"

جمیل بوکھلا گیا" شادی ؟ ۔۔ کب ؟"

تارہ نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا" جی، آج صبح ۔۔۔ آیئے میں آپ کو اپنے پتی سے ملاؤں "

جمیل چکرا گیا اور کچھ کہے سنے بغیر کھٹا کھٹ نیچے اتر گیا ۔۔۔ سامنے ٹیکسی کھڑی تھی ۔۔۔ جمیل کا دل ایک لمحے کے لیۓ ساکت سا ہو گیا۔ تیز قدم اٹھاتا وہ بڑے بازار کی طرف نکل گیا۔

معاً جمیل کو جاتے دیکھ کر ڈرائیور نے زور سے کہا " سیٹھ صاحب ٹیکسی ؟"

جمیل نے جھنجلا کر کہا ۔۔۔ نہیں کمبخت شادی !

شاہ صاحب سے جب میری ملاقات ہوئی تو ہم فوراً بے تکلف ہو گئے
مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ سید ہیں۔ اور میرے دور دراز کے رشتہ دار بھی ہیں
وہ میرے دور یا قریب کے رشتہ دار کیسے ہو سکتے تھے، اس کے تعلق میں کچھ نہیں
کہہ سکتا۔ وہ سید تھے اور میں ایک محض کشمیری!

بہرحال ان سے میری بے تکلفی بہت بڑھ گئی۔ ان کو ادب سے کوئی
شغف نہیں تھا۔ لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ میں افسانہ نگار ہوں تو انھوں
نے مجھ سے میری چند کتابیں مستعار لیں اور پڑھیں۔

یہ کتابیں جو کہ افسانوں کے مجموعے تھیں، انھوں نے پڑھیں اور مجھے
بہت تعجب ہوا کہ انھوں نے چند افسانوں کی بہت تعریف کی۔ انہی میں سے
یہ افسانے ایسے تھے جو ادبی دنیا میں شاہکار تسلیم کئے جا چکے تھے۔

شاہ صاحب میرے پڑوسی تھے۔ انھوں نے ایک مکان الاٹ [illegible]
تھا لیکن خاندان کے افراد چونکہ زیادہ تھے اس سبب [illegible]
فلیٹ کے نیچے موٹر گیراج پر بھی قبضہ کر رکھا تھا [illegible]
بیٹھک کا انتظام کیا تھا اور یہ زنانہ تھا۔ شاہ صاحب کے دوست [illegible]

بے شمار تھے۔ اس لیے اس گراج میں وہ ان کی خاطر مدارات کرتے تھے۔
ایک دن اُن سے افسانوں کے بارے میں باتیں ہوئیں تو انھوں نے مجھ سے کہا "میری زندگی میں ایسی کئی حقیقتیں ہیں جن کو تم افسانے بنا کر پیش کر سکتے ہو۔"

میں ہر وقت افسانوں کی تلاش میں رہتا ہوں، چنانچہ میں فوراً متوجہ ہوا اور شاہ صاحب سے کہا: "مجھے اُمید ہے کہ آپ اچھا مواد دیں گے۔"
شاہ صاحب نے جواباً کہا "میں افسانہ نگار نہیں ہوں —— لیکن میری زندگی میں ایک دن ایسا واقعہ ہوا ہے جو قابلِ ذکر ہے —— میں نے قابلِ ذکر اس لیے کہا ہے کہ آپ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ورنہ یہ واقعہ جو میں اب بیان کرنے والا ہوں میرے نزدیک بےحد حیرت انگیز ہیں۔
میں نے شاہ صاحب سے کہا: "ایسا بھی کیا حیرت انگیز ہوگا؟" پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد اس میں تھوڑی سی اصلاح کی: "لیکن ہو سکتا ہے کہ آپ کے لیے وہ واقعہ واقعی حیرت انگیز ہو۔"
شاہ صاحب نے کہا: "جی میں نہیں کہہ سکتا کہ جو واقعہ میں آپ کو سنانے والا ہوں، ہر شخص کے لیے حیرت کا باعث ہوگا —— میں صرف اپنی ذات کے متعلق آپ سے عرض کر رہا ہوں —— اور یہ حقیقت ہے کہ میں جو داستان آپ کو سناؤں گا، اس وقت تک میری زندگی میں محیر العقول حیثیت رکھتی ہے۔"
شاہ صاحب نے "نیل کٹر" سے اپنے ناخن کاٹنے شروع کیے۔ میں ان کی داستان سُننے کے لیے بیتاب تھا، مگر شاید وہ آغاز کے متعلق سوچ رہے تھے کہ اپنی داستان کہاں سے شروع کریں۔ میرا خیال درست تھا کہ جو کچھ

ان پر جیتا تھا اس کو کئی برس ہو چکے تھے۔ وہ تمام واقعات اپنے ذہن میں تازہ کر رہے تھے۔

میں نے سگریٹ سلگایا۔ انھوں نے اپنی دس انگلیوں کے ناخن کاٹ کر نیل کٹر تپائی پر رکھا اور مجھ سے مخاطب ہوئے "میں ان دنوں کابل میں تھا" یہ کہہ کر وہ چند لمحات خاموش رہے، اس کے بعد بولے "میری وہاں بہت بڑی دوکان تھی جس میں بڑھیا سے بڑھیا سامان موجود رہتا تھا"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "آپ جنرل مرچنٹ تھے؟"

شاہ صاحب نے جواب دیا "جی ہاں۔ کابل کا سب سے بڑا جنرل مرچنٹ ——— میری دوکان میں کابل کی قریب قریب ہر عورت سودا لینے آتی تھی ——— آپ سے میں ایک بات عرض کروں ——— ساتھ کے دوکاندار جب یہ دیکھتے تھے کہ کسی روز عورتوں کی بجائے میری دوکان میں دوکاندار ملتے ہیں تو وہ مجھ سے فارسی زبان میں افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ آغا جی کیا ہوا ——— کابل کی عورتیں اور لڑکیاں مر گئیں یا تمہارے نصیب سو گئے۔"

شاہ صاحب مسکرا دیئے تھے ——— اس کے علاوہ اور وہ کیا جواب دے سکتے تھے لیکن ان کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ ان کی دوکان میں گاہکوں کی اکثریت عورتوں اور لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ سب ان کی چرب زبانی کا معجزہ ہے۔

انھوں نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب! میں بہترین سیلزمین ہوں ——— خاص طور پر عورتوں کے ساتھ تو میں اس طرح سودا کر سکتا ہوں کہ یہاں لاہور میں کوئی بھی نہیں کر سکتا ہے۔ اسے یوں، تھوڑی بہت سائیکلوجی پڑھے بھی پڑھی ہے۔ اس لئے مجھے معلوم ہے کہ عورتوں سے کس طرح ڈیل کیا جاسکتا ہے۔

— یہی وجہ تھی کہ سارے کابل میں میری دوکان ہی ایسی تھی جس میں ہر وقت
کوئی نہ کوئی گاہک موجود رہتا تھا۔"

میں نے شاہ صاحب کی یہ خود تعریفی سنی اور ان سے کہا "یقیناً آپ
بہترین سیلزمین ہیں کیونکہ آپ کی گفتگو کا انداز ہی اس کا ثبوت ہے۔"

شاہ صاحب مسکرائے: "مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی داستان بہترین
سیلزمین کے انداز میں بیان نہیں کر سکوں گا۔"

میں نے ان سے کہا: "آپ شروع تو کیجیے۔"

شاہ صاحب نے چند لمحات اپنے حافظے کو ایک بار پھر ٹٹولا اور اپنی
داستان شروع کی: "منٹو صاحب! جیسا کہ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں میں کابل
میں تھا یہ کوئی دس برس پہلے کی بات ہے جب میری صحت بہت اچھی تھی۔ یوں تو
میں اب بھی تنومند کہلاتا ہوں، مگر اس زمانے میں میرا جسم آج کے مقابلے میں گنا
تھا۔ ہر روز ورزش کرتا تھا۔ بیٹھکیں ڈنٹر پیلتا تھا۔ مگدر گھماتا تھا۔ نہ سگریٹ
پیتا تھا نہ شراب۔ بس ایک اچھا کھانے کی عادت تھی۔ فغانی نہیں، ہندوستانی۔
چنانچہ میں امرتسر سے اپنے ساتھ ایک بہت اچھا کشمیری باورچی لے گیا تھا جو
ہر روز میرے لیے لذیذ سے لذیذ کھانے تیار کر کے میز پر رکھتا تھا ——— میری
زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی۔ آمدن بہت معقول تھی۔ بنک میں لاکھوں
روپے جمع تھے ——— لیکن ———"

شاہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ میں نے ان سے پوچھا
"لیکن کیا؟ آپ چپ ہو گئے ——— اس کا مطلب نہیں کہ آپ پھر
بھی ناخوش تھے۔"

شاہ صاحب نے عذر خواہانہ انداز میں کہا: "جی ہاں میں ان تمام آسائشوں کے باوجود

ناخوش تھا ــ اس لیئے کہ میں اکیلا تھا ــ مجرد تھا۔

اگر میری دکان میں عورتیں اور لڑکیاں زیادہ نہ آتیں تو بہت ممکن ہے مجھے اپنے تجرد کا احساس نہ ہوتا ــ لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ کابل کی ہر صاحب ثروت عورت میری دوکان میں آتی تھی۔

دکان میں داخل ہوتے ہی یہ عورتیں اور لڑکیاں اپنا برقعہ اتار کر ایک طرف رکھتیں اور سودا خریدنے میں مصروف ہو جاتیں۔ منٹو صاحب! ــ آپ کا شاید یہ خیال ہو کہ وہ بڑا شرعی قسم کا لباس پہنتی ہوں گی۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یوں تو وہاں کی عورتیں اور لڑکیاں پردہ کرتی ہیں مگر لباس ٹھیٹ یورپین پہنتی ہیں۔ سکرٹ، کٹے ہوئے بال۔ رنگے ہوئے ناخن۔ پنڈلیاں ننگی ــ جب وہ میری دوکان میں آتی تھیں، تو اپنے برقعے اتار کر ایک طرف رکھ دیتی تھیں اور مال دیکھنے میں مصروف ہو جاتی تھیں۔"

شاہ صاحب نے بولنا بند کیا تو میں نے اُن سے پوچھا: "آپ کو ان میں سے کسی سے محبت تو یقیناً ہو گئی ہوگی؟"

شاہ صاحب بہت سنجیدہ ہو گئے: "جی ہاں، ایک لڑکی سے ہو گئی تھی، جو اپنا برقع نہیں اُتارتی تھی۔ حتیٰ کہ نقاب بھی نہیں اُٹھاتی تھی۔"

میں نے ان سے پوچھا: "کون تھی۔"

انھوں نے جواب دیا: "ایک بہت بڑے گھرانے سے متعلق تھی۔ اس کا باپ فوج کا اعلیٰ افسر تھا، بڑا سخت گیر ــ مجھے اس سے صرف اس لیئے محبت ہوئی کہ وہ ہاتھوں کے علاوہ اپنے جسم کا کوئی حصہ نہیں دکھاتی تھی۔"

میں نے پوچھا "اس کی وجہ؟"

شاہ صاحب نے کہا: "مجھے معلوم نہیں اور نہ میں نے اس سے کبھی اس بارے

میں استفسار ہی کیا ـــــ لیکن میرے تصور میں وہ انتہا درجے کی حسین تھی۔ دُبلی پتلی جسم خواہ برقعے میں لپٹا ہو لیکن اس کے تناسب کے متعلق اندازہ لگانا کوئی اتنا زیادہ مشکل نہیں تھا ـــــ میں نے چور آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ جوانی کا آدرش مجسمہ ہے ـــــ لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ چند منٹوں کے لیئے میری دوکان میں آتی تھی چیزیں خریدنے اور ان کی قیمتوں کے بارے میں فیصلہ نے میں چند منٹ صرف کرتی تھی اور چلی جاتی تھی "

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "یہ سلسلہ کب تک جاری رہا ؟"

"قریب قریب چھ مہینے تک ـــــ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ میں اس سے اپنی محبت کا اظہار کروں ۔ میں اس سے بہت مرعوب تھا۔ اس لیئے کہ وہ دوسروں سے مختلف تھی ـــــ اس میں ایک عجیب قسم کی رعونت تھی۔ ـــــ میں اس کو بے طرح گھورتا تھا۔ حالانکہ یہ شائستگی نہیں تھی۔ لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا ـــــ منٹو صاحب ـــــ ایک دن میں دکان میں بیٹھا اسی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی نوکر نے رسیور اٹھایا اور مجھ سے کہا کہ کوئی خاتون آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں ۔ میں نے سوچا کہ کوئی گاہک ہوگی اور نئے مال کے متعلق پوچھنا چاہتی ہوگی ـــــ اٹھ کر میں نے رسیور ہاتھ میں لیا اور پوچھا ـــــ مادام ! آپ کیا چاہتی ہیں ۔ ؟ اُدھر سے آواز آئی "کیا آپ سید مظفر علی ہیں ؟" میں نے جواب دیا "جی ہاں ـــــ ارشاد ـــــ اب میں نے آواز پہچان لی تھی ـــــ یہ اسی کی تھی ـــــ اسی کی جو میری دُکان میں برقعہ نہیں اُتارتی تھی ۔ میں گھبرا گیا ـــــ منٹو صاحب ! یہ عاشق ہونا بھی عجیب لعنت ہے "

یہ سُن کر میں مُسکرا دیا "آپ ٹھیک فرماتے ہیں شاہ صاحب ۔ لیکن افسوس

کہ میں اس لعنت میں ابھی تک گرفتار نہیں ہوا۔"

شاہ صاحب کو بہت افسوس ہوا: "حد ہوگئی ہے۔ انسان اپنی جوانی میں کم از کم ایک مرتبہ تو ضرور عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے —— خیر —— آپ کو ابھی تک عشق نہیں ہوا تو خدا کرے کہ بہت جلد ہو جائے، کیونکہ یہ مرض بہت دلچسپ ہے۔"

میں نے مسکرا کر شاہ صاحب سے کہا: "آپ اپنی داستان بیان کیجئے —— مجھے عشق ہوگا تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اس کی پوری روداد سناؤں گا۔"

شاہ صاحب کرسی پر سے اٹھ کر پلنگڑی پر لیٹ گئے، اور آنکھیں بند کرلیں۔ "منٹو صاحب! —— میں اس لڑکی کے عشق میں اس بری طرح گرفتار ہوا کہ ورزش کرنا بھول —— وہ میری دوکان پر اکثر آتی تھی —— میں اس کو گھورتا تھا —— لیکن دیکھئے میرا دماغ کتنا خراب ہو گیا —— یہ اسی عشق خانہ خراب کا باعث ہے —— میں آپ سے اس کے ٹیلیفون کی بات کر رہا تھا —— جب میں نے ریسیور اٹھایا اور اس کی آواز پہچان لی تو اس نے مجھ سے کہا —— دیکھو، میں جب بھی تمہاری دوکان میں آتی ہوں، تم مجھے گھورتے ہو اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو ٹھیک ہو جاؤ۔ ورنہ تمہارے حق میں بہت برا ہوگا —— منٹو صاحب! میں جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کردیا —— میں دیر تک گم سم ... کو کان سے ساتھ لگائے کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ اس دھمکی کا مطلب کیا ہے۔"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا: "کیا وہ دھمکی اصلی تھی ..."

"جی ہاں —— جب دوسرے روز وہ میری دوکان پر آئی تو میں نے پھر اس کی طرف انہی نگاہوں سے دیکھا تو اس نے جھنجھلا کر میرے ... کے سامنے مجھ سے کہا —— تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم مجھے اس طرح تکتے ہو —— میں

سُن ہو گیا ـــ لیکن اس نے چند چیزیں خریدیں ۔ دام دیئے اور اپنی موٹر میں بیٹھ کر چلی گئی "

میں شاہ صاحب کی داستان میں کافی دلچسپی لے رہا۔" عجیب لڑکی تھی ـــ آپ سے اسے نفرت بھی تھی، مگر اس کے باوجود آپ کی دکان میں آتی تھی "
شاہ صاحب نے آنکھیں کھولیں" منٹو صاحب! یہی وجہ تھی کہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کی نفرت وحقارت مصنوعی ہے۔ دراصل وہ میری محبت سے متاثر ہو چکی ہے اور محض بناوٹ کے طور پر غصے کا اظہار کرتی ہے ـــ لیکن جب ایک روز اُس نے مجھے بہت زور سے لعن طعن کی، میں سرد ہو گیا ـــ پر اُس کی محبت تھی جو میرے دل سے جاتی ہی نہیں تھی ـــ میں نے بہت کوشش کی اس کو بھول جاؤں، میں نے خود کو سمجھایا کہ تم عجیب بیوقوف ہو۔ ایک لڑکی جس کی تم نے شکل نہیں دیکھی ـــ جو تم سے نفرت کرتی ہے، تم اس سے عشق فرما رہے ہو۔ باز آؤ۔ تمہارا کاروبار ماشاءاللہ بہت اچھا ہے۔ سارے افغانستان میں تمہاری ساکھ ہے۔ یہ کیا جھک مار رہے ہو ـــ لیکن منٹو صاحب عشق بری بلا ہے ـــ میں اس سے اپنا پیچھا نہ چھڑا سکا "
میں نے ان سے کہا" آپ خواہ مخواہ داستان طویل بناتے جا رہے ہیں انجام پر پہنچیے "
شاہ صاحب پلنگڑی پر سے اُٹھے اور کرسی پر بیٹھ گئے " حضرت! ایسی داستانیں اکثر طویل ہوا کرتی ہیں۔ عشق ایک مرض ہے ـــ اور مرض جب تک طول نہ پکڑے، مرض نہیں ہوتا ـــ محض ایک مذاق ہوتا ہے ـــ خیر ـــ اب جبکہ آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنی داستان طویل نہ بناؤں تو مختصر طور پر عرض کرتا ہوں کہ میرا عشق جب بہت شدت اختیار کر گیا تو ایک روز میں

بے اختیار رونے لگا۔ میرے شہر میں امرتسر کا ایک باشندہ سردار بلونت سنگھ تھا جو بھیٹھے کے ایک اچھے خاندان کا فرد تھا۔ وہ کابل میں ایک انجنیئرنگ فرم میں ملازم تھا۔ کھانے پینے والا آدمی تھا اس لیئے وہ ہر مہینے مجھ سے پچاس ساٹھ روپے قرض لے جاتا تھا۔

مزید قرض لینے کی غرض ہی سے وہ اس وقت میری دوکان میں آیا جبکہ میری آنکھیں نمناک تھیں، وہ میرے پاس کرسی پر بیٹھ گیا اس نے معلوم نہیں مجھ سے کیا پوچھا اور میں نے جانے کیا جواب دیا۔ لیکن جب اس نے مجھ سے یہ کہا کہ "دوست تم کو کوئی روگ لگ گیا ہے تو میں چونک پڑا "نہیں، نہیں —— ایسی کوئی بات نہیں —— سردار بلونت سنگھ بھیٹھیا اپنی گھنی مونچھوں کے اندر مسکرایا —— تم جھوٹ بولتے ہو، صاف صاف بتاؤ، تمہیں یہاں کس سے عشق ہوا ہے —— میں خاموش رہا تو پھر بولا، دیکھو اگر کوئی مشکل درپیش ہے تو ہم سب ٹھیک کر دینگے —— جب اس نے اس قسم کی چند اور باتیں کیں تو میں نے سارا معاملہ اس کو بتا دیا۔"

میں نے پوچھا "تو اس نے مشکل آسان کرنے کا کیا گر بتایا؟"

"منتر —— ؟"

"جی ہاں"

"آپ سید ہیں —— کیا آپ منتر جنتر پر ایمان لا سکتے ہیں؟"

شاہ صاحب نے کہا "لانا تو نہیں چاہیئے تھا کہ یہ ہمارے مذہب میں جائز نہیں —— لیکن اس وقت سردار بلونت سنگھ کا مشورہ ماننا ہی پڑا، اس لیئے کہ عشق بری بلا ہے —— اُس نے مجھے ایک منتر بتایا اور کہا کہ سات رنگوں کے پھول لو۔ اُن میں سے ہر ایک پر یہ منتر پڑھ کر پھونکو اور منگل کے روز اس لڑکی کو کسی نہ کسی طریقے سے سنگھا دو —— یہ منتر مجھے ابھی تک یاد ہے۔"

میں نے ان سے کہا "ذرا سُنائیے تو"
شاہ صاحب نے ایک لحظے کے لیے حافظے کو ٹٹولا اور کہا:

کورو دیس مکھیا دیوی
پھُل کھڑے پھل ہنسے
پھل لگے نہ برسنگھ پیارے
جو کوئی لے پھولوں کی باس
کبھی نہ چھوڑے ہمارا ساتھ
ہمیں چھوڑ کسی اور کو کرے
پیٹ پھول بھسم ہو مرے
دہائی سلیمان پیغمبر کی

میں نے یہ منتر سُنا تو مجھے اپنا لڑکپن یاد آ گیا۔ جب میں نے منتروں کی ایک کتاب خریدی تھی اور اس میں سے ایک منتر ازبر اس غرض سے کیا تھا کہ میں اسکول کے تمام امتحانوں میں پاس ہوتا چلا جاؤں گا ــــ یہ منتر مجھے اب بھی یاد ہے ــــ اونگ نما کا مشیری اُتما دے بھر نگ پراسواہ ــــ لیکن اس کے پڑھنے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں نویں جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔

میں نے اس منتر کا ذکر شاہ صاحب سے نہ کیا اور ان سے پوچھا "تو آپ نے سات رنگ کے پھولوں پر یہ منتر پڑھا؟"

"جی ہاں ــــ میں نے سات رنگ کے پھول سوموار کو منگوائے ... پر یہ منتر پڑھا اور اس لڑکی کو ٹیلیفون کیا کہ میری دکان میں جیولری کا بہت سا اچھا مال آیا ہے منگل کو وہ آ کر دیکھ لے۔

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "کیا وہ آئی؟"

"جی ہاں وہ آئی ـــ اس نے مجھے ٹیلیفون پر کہہ دیا تھا، کہ وہ آئے گی شام کو پانچ بجے کے قریب میں اس کا انتظار کرتا رہوں۔ وہ ٹھیک پانچ بجکر پانچ منٹ پر آئی اور اس نے چیکوسلواکیہ کے نئے مال کے متعلق استفسار کیا ـــ عرض ہے کہ مال رال کا قصہ بالکل فراڈ تھا ـــ میں نے اس سے کہا کہ ملازموں نے ابھی تک پیٹیاں نہیں کھولیں، آپ کل تشریف لائیے گا۔ وہ بہت جز بز ہوئی، میں منتر پڑھے پھولوں کی طرف دیکھ رہا تھا ـــ اتفاق کی بات ہے کہ اس نے بھی ان پھولوں کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا، یہ پھول تمہاری میز پر کہاں سے آگئے؟ ـــ میں نے عرض کیا یہ میں نے آپ کے لیے خریدے تھے۔ اگر آپ کو پسند ہوں ـــ میرا مطلب ہے اگر آپ کو ان کی خوشبو پسند ہو تو آپ انہیں قبول فرمائیں ـــ اس نے وہ سات پھول اٹھائے اور انہیں سونگھا۔"

میں نے ان سے پوچھا۔ "اس لڑکی کا ردِ عمل کیا تھا؟"

شاہ صاحب نے جواب دیا "اس نے ناک بھوں چڑھا کر مجھ سے کہا ـــ یہ پھول ہیں؟ ـــ ان میں خوشبو ہے نہ بدبو ـــ بہر حال اس نے وہ پھول سونگھے چند چیزیں خریدیں اور چلی گئی۔ شام کو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا میری دوکان پر آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا ـــ کہو وہ پھول سنگھا دیئے؟ میں نے اس سے کہا سنگھا تو دیئے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلے گا، یہ معلوم نہیں۔ سردار بلونت ہنسا۔ اس نے بڑے زور سے میرا ہاتھ دبایا اور کہا، دوست اب تمہارا کام سمجھو کہ پندرہ آنے ہو گیا۔

مجھے بڑی حیرت تھی کہ منتر کے ذریعے سے ایسا کام پندرہ آنے کیوں کر ہو سکتا ہے، مگر سید صاحب نے کہنا شروع کیا "منٹو صاحب! آپ یقین مانیئے کہ میرا کام پندرہ آنے مکمل ہو گیا ـــ دوسرے دن کو کو جان کا ٹیلیفون آیا کہ وہ

کچھ خریدنے کے لیئے آ رہی ہے ۔میں نے اس کا استقبال کیا ـــــ وہ کوئی چیز خریدنا نہیں چاہتی تھی ۔ بہت دیر تک وہ میری دکان میں ادھر اُدھر پھرتی رہی اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئی "تم سے میں کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے گھورا نہ کرو ـــــ اور وہ جو تم نے پھول سنگھائے تھے ۔ اس کا کیا مطلب تھا ؟"

میں نے کوکو جان سے لکنت بھرے لہجے میں کہا "میں ۔ میں ـــــ وہ پھول جو تھے ـــــ پھول تھے ـــــ میں نے ـــــ میں نے ـــــ مال جو جیکوسلواکیہ سے آیا تھا، کھلا ہوا نہیں تھا، اس لیئے میں نے وہ پھول آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے ـــــ کوکو جان برُتیے میں سخت مضطرب تھی ـــــ اس نے مجھ سے اضطراب بھرے لہجہ میں کہا تم نے مجھے پھول کیوں سُنگھائے ؟ ـــــ میں نے اس سے بڑے معصومانہ انداز میں پوچھا ۔کیا آپ کو اس سے کوئی تکلیف ہوئی ؟ ـــــ وہ بڑے گرم انداز میں بولی "تکلیف ـــــ میں ساری رات وہ سات پھول دیکھتی رہی ہوں ـــــ پھول آتے تھے اور جب میں انہیں حاصل کرنا چاہتی تھی تو وہ موئے پرے ہٹ جاتے تھے ــ یہ کیسے پھول تھے ؟"

میں نے جواب دیا" میرے وطن کے تھے ـــــ چونکہ میرے وطن کے تھے اس لیئے میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیئے ـــــ لیکن مجھے حیرت ہے کہ وہ رات بھر آپ کو کیوں نظر آتے اور ستاتے رہے ؟"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "یہ پھول آپ نے کہاں سے منگوائے تھے ؟"

شاہ صاحب نے جواب دیا" جی، منگوائے کہاں سے تھے، وہیں افغانستان کے تھے ـــــ نہایت واہیات قسم کے پھول، جن میں خوشبو نام کو بھی نہیں تھی ـــــ شام کو سردار بلونت سنگھ آیا، مزید قرض لینے کے لیئے ـــ اُس نے مجھ سے قرض لینے سے پہلے دریافت کیا، کہیئے شاہ صاحب اس معاملہ کا کیا ہوا ؟ ـــ

میں نے اس کو ساری بات بتادی۔

وہ قرض لینا بھول گیا۔ اپنا بالوں بھرا ہاتھ میرے کندھے پر زور سے مار کر چلایا ـــــ شاہ جی آپ کا کام سو فیصد ہو گیا ہے۔ وسکی کی ایک بوتل منگا لیجئے۔

شاہ صاحب نے مجھے بتایا کہ انھوں نے وسکی کی بوتل کے علاوہ ایک ڈبہ سگرٹوں کا بھی منگوایا جس میں سے سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا تمباکو نوشوں کے سے انداز میں پے در پے کئی سگریٹ پھونکتے رہے جب جانے لگے تو انھوں نے شاہ صاحب سے کہا کہ دیکھو ابھی تھوڑی سی کسر باقی ہے۔ اگلے منگل کو تم اور سات پھول لو اور ان پر دہی منتر پڑھ کر اس لڑکی کو سنگھا دو ـــــ بیڑا پار ہو جائے گا۔

شاہ صاحب بہت پریشان ہوئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اب کی بار کرو جان کو پھول کیسے سونگھا سکیں گے جب کہ وہ اس معاملے کے متعلق شاکی تھی۔ لیکن معاملہ عشق کا تھا اس لیے شاہ صاحب موت کے منہ میں جانے کے لیے بھی تیار تھے۔

شاہ صاحب نے بشادر سے پھول منگوائے ـــــ ان میں سے سات منتخب کیے۔ اور ہر ایک پر منتر پڑھا اور اپنے میز کے گلدان میں رکھ دیئے اس کے علاوہ انھوں نے [illegible] دوکان میں جا بجا گلدان رکھوائے اور ان میں پھول سجا دیئے۔

پیر کو شاہ صاحب نے کرو جان کو ٹیلیفون کیا اور آہستہ سے جھوٹ بولا کہ چیکوسلواکیہ کا مال کھل گیا ہے آپ آئیے اور دیکھ لیجئے۔ کرو جان آئی مگر مال وہاں موجود نہیں تھا ـــــ شاہ صاحب تھوڑی دیر تک [illegible] پھر

ذرا ہوش سنبھال کر اپنے نوکروں کو لعن طعن کی کہ تم نے ابھی تک ماں کیوں نہیں کھولا۔

کوکو جان کے ساتھ اس کی والدہ بوبو جان تھی۔ وہ ایک طرف ٹائیلٹ کا سامان دیکھنے میں مصروف تھی۔ کوکو جان نے جب جابجا پھول دیکھے تو وہ متعجب ہونے کے علاوہ مضطرب بھی ہوئی۔

میری میز پر وہ خاص پھول پڑے تھے۔ وہ ان کے پاس آئی گلدان میں سے اٹھا کر اس نے انہیں سونگھا اور مجھ سے کہا: یہ افغانستان کے پھول ہیں؟

میں نے جواب دیا" جی ہاں —— یہ میرے وطن کے ہیں۔ اور میں نے خاص آپ کے لیئے منگوائے ہیں۔ بوبو جان خرید و فروخت میں مشغول تھی اس دوران میں کوکو سے میں نے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا وہ سخت ناراض ہوئی اور اپنی ماں کے ساتھ چلی گئی —— شام کو سردار بلونت سنگھ بھیٹھیا آیا۔ اس سے بات چیت ہوئی میں نے اس کو دس روپے قرض دیئے۔ جب اس نے روپے اپنی جیب میں ڈالے تو مجھ سے پوچھا" آج منگل ہے —— وہ پھول سُنگھا دیئے تھے آپ نے؟ —— میں نے سارا واقعہ سُنا دیا۔

سردار بلونت سنگھ نے اپنا بالوں بھرا ہاتھ زور سے میرے ہاتھ پر مارا اور کہا: شاہ جی، اب کام سترہ آنے پورا ہو گیا ہے —— وسکی کی ایک بوتل منگاؤ۔ شاہ صاحب نے وسکی کی بوتل منگائی۔ سردار بلونت سنگھ بھیٹھیا نے آدھی دکان میں پی لی اور آدھی اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے شاہ صاحب سے پوچھا دوسری بار پھول سنگھانے سے کیا نتیجہ برآمد ہوا۔

شاہ صاحب نے جواب دیا: وہ بہت بے چین ہو گئی اُسے ... رات بھر

پھول نظر آنے لگے کہ ایک دن وہ سخت اضطراب کی حالت میں آئی۔ بُرقع جو اُس نے کبھی اُتارا نہیں تھا کیلے کے چھلکے کی طرح اُتار کر ایک طرف پھینکا اور مجھ سے مخاطب ہوئی ـــــ "دیکھو شاہ تم نے مجھ پر کوئی جادو کر دیا ہے"
میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا ـــــ جو مجھے پہلی بار نظر آیا تھا منٹو صاحب! میں نے اپنی زندگی میں اس جیسی حسین لڑکی اب تک نہیں دیکھی ـــــ میں اس کو دیکھتا رہا ـــــ اس نے بڑے تیز و تند لہجے میں کہا "تم نے مجھے پھول کیوں سُنگھائے تھے ـــــ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں ـــــ دن ہو یا رات، ہر وقت مجھے وہ پھول دکھائی دیتے ہیں ـــــ مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہوں۔ میرے والدین عنقریب میری شادی کر رہے ہیں۔ تم نے مجھ پر کیا جادو پھونکا ہے ـــــ یہ کہکر اس نے میری میز پر گلدان میں سے پھول نکالے۔ اور فرش پر پھینک اپنی سینڈل سے مسل دیئے ـــــ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ناراض ہونے کے باوجود ناراض نہیں تھی اور چاہتی تھی کہ میں اس سے باتیں کروں، لیکن مجھے اس کا یقین نہیں تھا اس لیئے میں خاموش رہا ـــــ وہ کچھ دیر غصہ کی حالت میں کھڑی رہی۔ اس کے بعد اُس نے بُرقع پہنا اور چلی گئی"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "تو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا کا منتر کام کر گیا؟"
"جی ہاں کام کر گیا ـــــ اس کو پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ یہ سب بکواس ہے مگر گوکو جان کی باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ منتر اپنا اثر کر گیا ہے حالانکہ جو منتر آپ سُن چکے ہیں۔ اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے آدمی کو یہ معلوم ہو کہ وہ اثر کرے گا ـــــ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب وہ پھر میری دکان میں آئی تو برقعہ اُتار کر مجھ سے بغلگیر ہو گئی اور رونا شروع کر دیا

— میں نے اُس کے ہونٹوں سے تبسم چرا لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی —
تھوڑی دیر کے بعد میری میز پر گلدان میں جو پھول پڑے تھے اس نے نکالے
اور انہیں نوچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ برقعہ اوڑھ کر
تیزی سے باہر نکل گئی۔

داستان کافی طوالت پکڑ رہی تھی۔ میں نے شاہ صاحب سے کہا: "آپ
مختصراً فرمایئے کہ انجام کیا ہوا؟ — کیا وہ لڑکی آپ کو مل گئی؟"

شاہ صاحب نے ایک آہ بھری "جی نہیں۔ اس کی شادی ہو گئی۔ مگر حجلۂ
عروسی میں داخل ہوتے ہی معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ گری اور گرتے ہی مر گئی —
اس کے ہاتھ میں سات پھول تھے، مختلف رنگوں کے۔"

میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کی پلنگڑی کے ساتھ تپائی پر پیتل کے گلدان
میں سات مختلف رنگوں کے پھول اُڑسے ہوئے تھے۔

(ختم شد)